سلسلۂ نصابات تعلیمِ عامۂ جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند

کتاب چہارم

برائے انٹرمیڈیٹ

مؤلفہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

۱۳۴۱ھ مطابق ۱۳۳۲ف مطابق ۱۹۲۲ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن
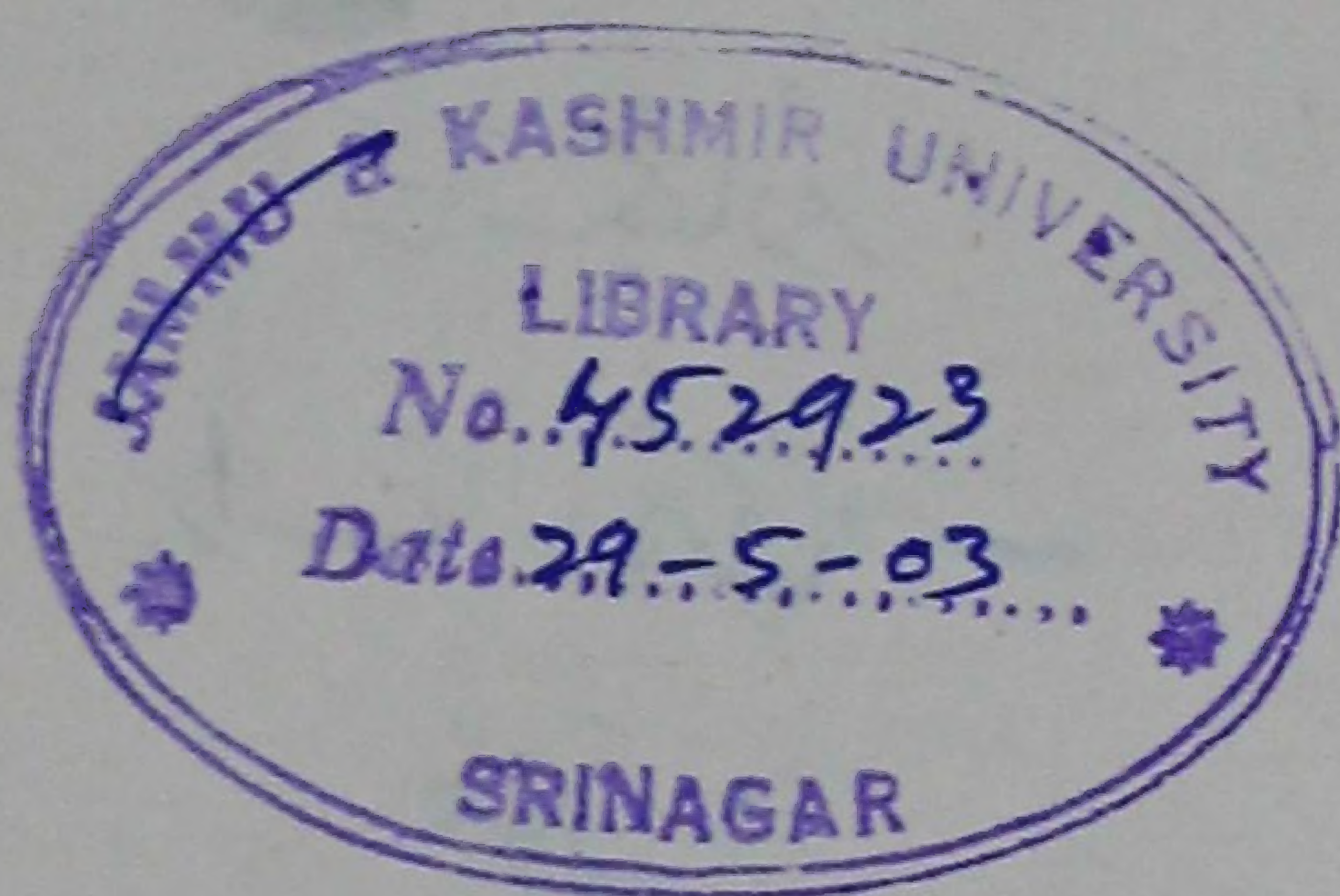
فہرست مضامین
کتاب چہارم تاریخ ہند

باب اول ۔ نئی طاقتیں   صفحہ ۱ تا ۳۰

باب دوم : اہل یورپ کی آمد ہند میں ۔   ۳۱ تا ۵۳

باب ششم۔ عہد شاہان برطانیہ۔ ۱۵۴ تا ۱۸۶

۱۔ اہم تاریخی واقعات:-

۲۔ جدید تعلیم و تمدّن:-

۳۔ آئین و اصولِ حکومت:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ ہند

کتاب چہارم

باب اول

نئی طاقتیں

۱۔ مرہٹوں کا فروغ

میدان کرنال و پانی پت کی پہلی لڑائیاں ہندوستان میں کسی نئے خاندان کی بہتر و قوی تر بادشاہی کا افتتاح کرتی ہیں لیکن یہ آخری لڑائی اہل ہند کی مرکزی سلطنت کا ایسا خاتمہ ثابت ہوئی جس کے بعد پھر اہل ہند خود تمام ممالک ہند میں کوئی متحد اور مرکزی حکومت نہ قائم کر سکے اور خود احمد شاہ ابدالی کے دل میں اگر اس قسم کا ارادہ تھا بھی تو اس کے ہموطن سپاہیوں نے رفاقت نہ کی اور اسے مجبوراً صوبۂ پنجاب پر اکتفا اور دہلی سے دو تین ہی مہینے میں مراجعت کرنی پڑی۔ شاہ جہاں کے اس ویران شدہ دار السلطنت میں شہزادۂ عالی گہر پسر عالمگیر ثانی کی بادشاہی کا اعلان کرا دیا گیا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد (شاہ عالم ثانی کے لقب سے) صوبۂ بہار کے ایک مقام پر پٹنہ میں تخت نشین ہوا (جمادی الثانی ۱۱۷۳ھ / ۱۷۶۱ء) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض رسم قدیم کو پورا کرنا تھا ورنہ بہار و بنگال میں شاہ عالم کی پیہم ناکامیوں نے اس بات کا بھی امکان باقی نہ رکھا تھا کہ وہ کم سے کم شمالی ہند ہی کا فرماں روا ہو جائے گا۔

سلطنت ہندوستان کے تازہ ترین آرزومند، سداشیو (بھاؤ) کا وہ سر ہی نہ رہا جس میں سلطنت کی آرزو تھی۔ پانی پت کے "مقتل" میں اس کی لاش بے سر کی ملی اور بہت دن تک شبہ رہا کہ یہ لاش اسی کی تھی یا کسی اور کی؟

شمالی یا جنوبی ہند کی کسی طاقت میں نہ یہ قابلیت تھی نہ ہوس کہ سلاطین تیموریہ کی جگہ لینے کا

تہیہ کرتی۔ غرض نئے نئے خودسر گروہ پیدا ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک ہند کا سیاسی شیرازہ بکھر بکھر گیا اور دستور کے مطابق جا بجا ئی ریاستیں یا تو بیں خود مختار ہو گئیں اور تقریباً نصف صدی تک سارے ملک میں اسی طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ان ریاستوں کے مفصل حالات لکھنے کا یہ محل نہیں ہے اور جہاں تک ممکن ہو ہم ممالک ہند کی مجموعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ اس باب میں اس قسم کی بعض نوخیز اور بڑی ریاستوں کا علیحدہ علیحدہ اجمالاً ذکر کرنا پڑے گا تاکہ انگریزی تاجروں کی آمد اور آئندہ تمام ممالک ہند پر تسلط پانے کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

مرہٹوں کی ریاست

بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں دکن کی مرہٹہ قوم کو جو سیاسی قوت حاصل ہوئی اس کا بانی عام طور پر سیواجی کو سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخی لحاظ سے وہ مرہٹوں کی قومی تاریخ کے سلسلے میں ایک بیچ کی کڑی ہے ورنہ اس قوم کو سب سے پہلے ملک عنبر حبشی نے، یا کہنا چاہیئے کہ احمد نگر و بیجا پور کی جنگی ضرورتوں نے، سپہ گری سکھائی اور خود مرہٹوں میں ساہوجی (بھونسلہ) پہلا شخص ہے جس نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم قوم سپاہیوں کو ایک ممتاز فوجی جمعیت میں منتظم کیا اور اپنے واسطے تاریخ ہندوستان میں جگہ نکال لی۔ بے شبہ سیواجی کی یورش و دلیری نے دور دور کے مرہٹوں میں جنگی جذبات پیدا کر دیئے اور ان میں قومی اتحاد کی روح پھونک دی، جو اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن خود اس کا طرز عمل کسی باقاعدہ اور مستقل حکومت کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اور قرائن کہتے ہیں کہ راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کی تادیبی مہم (۱۰۷۵ھ) نے اس بات کا خود سیواجی کو یقین دلا دیا تھا چنانچہ آئندہ اس کی قزاقانہ تاخت و تاراج میں فی الجملہ کمی ہو گئی اور وہ اپنے علاقے میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے پر متوجہ ہو گیا، لیکن یہ ریاست بھی کوئی خاص قوت و پائداری حاصل کرنے نہ پائی تھی کہ سنبھاجی کی شوریدہ سری نے مغلوں کے ہاتھ سے اس کا خاتمہ کرا دیا اور مغل بادشاہ (اورنگ زیب) کے طویل قیام دکن اور کارگر انتظامات نے مرہٹوں کی نیم آزادانہ حیثیت بھی باقی نہ رہنے دی۔

سنبھاجی کے فرزند ساہوجی نے اورنگ زیب کے لشکر میں پرورش پائی اور گو اس کی حیثیت ایک شاہی قیدی کی سی تھی بایں ہمہ مغل بادشاہ کی مہر و عنایت کی بہت سی روائتیں فارسی اور نیز مرہٹی تحریروں میں محفوظ ہیں کہ وہ ساہو کے ساتھ اپنے خاندانی لڑکوں کا سا برتاؤ کرتا تھا، اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جب اسے باج گزاری کی شرط پر مغلوں نے رہائی دی تو وہ خود اس شرط کی خلاف ورزی کرنی نہ چاہتا تھا لیکن آئندہ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ مرہٹوں کی حکومت اول اول

بالقوۃ اور آخر کار علانیہ ہندوستان کی ایک خود مختار و قوی سلطنت بن گئی ہو

پیشوا کا اقتدار

یہ اہم تغیر یعنی پہلے جبراً و بے قاعدہ اور پھر باقاعدہ حکومت و بادشاہی کر کا شعور مرہٹوں میں بہت کچھ ساہوجی کے اُن برہمن وزیروں کی محنت و ذہانت کا نتیجہ تھا جو "پیشوا" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ابتدا میں یہ عہدہ دار دوسرے درجے کا وزیر سمجھا جاتا تھا لیکن جب بالاجی (وشوناتھ) پیشوا مقرر ہوا (سنہ ۱۷۱۴ء)، تو اس کے ذاتی رسوخ سے رفتہ رفتہ یہ منصب سب سے اعلیٰ اور آخر میں موروثی اور اصلی حاکم کے مُرادف ہو گیا۔ بالاجی نے راجہ ساہو کے بہت سے اندرونی جھگڑے رفع کیئے اور اسی ضمن میں امیر الامرا سید حسین علی خاں سے چوتھ اور سردیس مکھی کے متعلق وہ سند حاصل کی جس کا پچھلے حصّے میں ذکر آچکا ہے۔ اس سند کی تصدیق محمد شاہ کے عہد میں ہوئی (سنہ ۱۷۱۹ء) اور اس نے اوّل تو ساہو کو تارا بائی اور اس کے فریق کے مقابلے میں مرہٹوں کا مسلّمہ سردار و رئیس بنا دیا اور دوسرے وصول مالگزاری کی غرض سے بالاجی کو ایک وسیع محکمہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ماتحت عمّال ممالکِ دکن کے قریب قریب ہر ضلع میں نظر آنے لگے اور اس واقعے نے نہ صرف مرہٹہ حکومت کی وقعت بلکہ مرہٹوں میں خود پیشوا کا اعزاز و اقتدار بڑھا دیا ہو

بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا ہوا (سنہ ۱۷۲۰ء) وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ بلند حوصلہ اور جنگجو سردار گزرا ہے اور اگر (سیواجی کے بعد) اسے مرہٹہ قوم کا سب سے بڑا شخص کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ اپنی فراست سے یہ بات بخوبی سمجھ گیا تھا کہ سلطنتِ مغلیہ کی جڑ میں گھُن لگ چکا ہے اور ایک عالمگیر اصول کے مطابق کسی نئی قوم کے اُبھرنے کا ٹھیک وقت وہی ہے جب کہ کوئی دوسری قوم حالتِ زوال میں ہو اور نئے لوگ کمال مستعدی کے ساتھ اس کی گرتی دیوار سے اپنی عمارت کے لیئے سنگ و خشت جمع کریں۔ یہاں دوبارہ یہ وضاحت کر دینی مناسب ہوگی کہ آج جب کہ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ ہوئے مدّت گزر چکی ہے اُس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا کہ محمد شاہ کے عہد ہی سے اس سلطنت میں زوال پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود محمد شاہ کے معاصرین بھی اس بات کا یقین رکھتے تھے، یا یہ کہ وہ سلطنت کی روز افزوں خرابی کو اُسی وقت سے ناقابلِ اصلاح سمجھنے لگے تھے، اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، محمد شاہ کی زندگی تک ہندوستان کے ذی اثر لوگوں پر مغل بادشاہ کا بہت کافی رعب رہا اور مرہٹوں کی قوم کو اس کی زندگی میں علانیہ خود مختاری کا دعویٰ کرنے کی ہمت نہ ہوئی البتہ یہ پہلی قوم تھی جو پیشوا کی سرکردگی میں مرکزی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے سب لیئے

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گھس پڑی اور جہاں گنجائش ملی، قابض ہوگئی ؎

گجرات و مالوہ پر تصرف

گجرات اور مالوے کے صوبہ داروں نے مرکزی حکومت سے اختلاف اور اپنے ذاتی رقیبوں سے جھگڑوں کی وجہ سے مرہٹوں کو امداد کے واسطے خود طلب کیا اور وہاں بھی چوتھ وصول کرنیکا حق انھیں دے دیا تھا لیکن اول تو حکومت دہلی نے ان کے اس حق کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا دوسرے نواب نظام الملک آصفجاہ کے خوف سے وہ بہت دن تک اس حق سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے تا آنکہ نواب آصفجاہ نے اس خیال سے کہ کہیں بالاجی شہنشاہ دہلی سے حکومت دکن کی کوئی سند نہ حاصل کرلے بالاجی سے مصالحت کرلی جو ایک طور پر مرہٹوں کیلئے اجازت ہوگئی کہ وہ صوبہ اے شمال میں تاخت و تاراج کریں۔ ؎ ۱۷۲۲ء

ان صوبوں میں چوتھ وصول کرنے کے واسطے حسب دستور باجی راؤ نے چند مرہٹہ سردار مقرر کئے تھے اور انہی کے خاندان گائیکواڑ، سندھیا اور ہلکر کے نام سے اب تک گجرات و مالوہ کے اقطاع پر حکمراں ہیں، مرہٹوں کا چوتھا مشہور خاندان بھونسلہ پہلے سے برار میں راجہ ساہو کی نیابت کرتا تھا باجی راؤ کی اس خاندان کے سردار رگھوجی بھونسلہ سے مخالفت تھی اور اس نے پیشوا کو دو ایک مرتبہ سخت زک بھی دی ؎

آئندہ چند سال تک باجی راؤ کچھ اندرونی جھگڑوں میں اور کچھ دربار دہلی سے خط کتابت میں معروف رہا کہ گجرات و مالوہ میں چوتھ وصول کرنے کی باقاعدہ سند حاصل کرلے، اس میں بلا وقت کامیابی کی امید اس لئے تھی کہ ان دنوں خان دوراں خاں اور ایرانی امرا کا دربار محمد شاہ میں بہت رسوخ ہوگیا تھا اور یہ لوگ تورانی امیروں کی رقابت میں چاہتے تھے کہ ممکن ہو تو مرہٹوں سے مصالحت کرکے انھیں نواب آصفجاہ سے لڑادیں جو تورانیوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور ناعاقبت اندیش خان دوراں خاں (وزیر جنگ) کا محسود، چنانچہ دہلی کے یہ امرا دکن کے صوبوں میں بادشاہ کی طرف سے مرہٹوں کو یک عُشر کے بجائے یک خُمس ("سردیش پانڈے گری") کا حق نیز راجپوتانے کی ریاستوں سے چوتھ وصول کرنیکی اجازت دینے پر آمادہ ہوگئے لیکن باجی راؤ کا اصلی مطالبہ گجرات اور مالوے کے متعلق تھا اور نواب آصفجاہ کو حکومت دہلی کا مخالف سمجھکر وہ بادشاہ کی فوجی قوت کو بہت حقیر سمجھنے لگا تھا، لہذا اُس نے

؎ گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ اس کے متعلق نواب نظام الملک اور پیشوا کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا (جلد اول صفحہ ۴۲۱) لیکن مؤلف نے اُس کی مفصل شرایط تحریر نہیں کیں نہ اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ؎

اپنے مطالبات میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ سن کر کہ دہلی میں بھی مقابلے کی جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ بندیل کھنڈ سے آگرے کی طرف بڑھا اور ایک فوج کو اس نے جمنا کے پار بھیجا کہ دوآب کا علاقہ تاراج کر دے اس فوج کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نے سخت شکست دی اور ادھر مرہٹوں کی اصلی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیئے وزیرالممالک قمرالدین خاں اور خان دوراں خاں آگرے کے آگے تک بڑھ آئے (۱۷۳۷ء، ۱۱۴۹ھ) باجی راؤ نے مقابلے سے پہلو تہی کی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے چکر کھا کر یک بہ یک پایۂ تخت دہلی کے قریب آنکلا۔ خاص شہر پر اسے پھر بھی حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور حوالی میں صرف کچھ ہندو اس کی غارت گری کا شکار ہوئے جو شہر کے باہر کالکا کے مندر میں تہوار منانے اور پوجا کرنے آئے تھے[۱] پھر بادشاہی فوجوں کا اپنے تعاقب میں آنا سن کر وہ بہ عجلت میوات کے راستوں سے دکن واپس ہو گیا (۱۱۵۰ھ) اور اس ناکامی نے غالباً اسے یقین دلا دیا کہ گو حکومت دہلی میں اپنے بعید صوبوں کا انتظام درست رکھنے کی صلاحیت باقی نہیں ہے تاہم مغل بادشاہ کی فوجی قوت پر خاص اس کے مرکز میں حملہ کرنا جوکھوں سے خالی نہیں، چنانچہ آئندہ نادر شاہ کے حملے اور اہل دہلی کی سخت پریشاں حالی کے باوجود باجی راؤ نے چنبل سے اوپر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس کی باقی زندگی جنوبی ہند اور مالوے کی لڑائیوں میں صرف ہوئی اور ہر چند اپنی وفات کے وقت (۱۷۴۰ء، ۱۱۵۳ھ) وہ بہت سی مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ مرہٹوں کو صحیح معنی میں حکومت و سلطنت کے راستے پر اسی نے ڈالا اور اسی کی اولوالعزمی کی بدولت وہ قزاقوں کے بے ترتیب گروہ کے بجائے ہندوستان کی سب سے ترقی پذیر قوم بن گئے اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہئے کہ مرہٹوں کے اصلی رئیس کا پیشوا کے سامنے محض برائے نام راجہ رہ جانا، ایسی اندرونی خرابی تھی جس نے ان کی قوم کی مجموعی قوت کو زیادہ عرصے تک مستقل اور متحد نہ رہنے دیا، ان کے مختلف سردار جس قدر زیادہ طاقتور ہوتے گئے اسی قدر اپنی صدر حکومت کے قابو سے باہر ہوتے گئے، اور حق یہ ہے کہ اس خرابی کے ذمہ دار ایک حد تک یہی برہمن پیشوا تھے جنھوں نے حکومت کے اصلی وارث کو رفتہ رفتہ عضو معطل کر دیا تھا۔

بہر حال، اب نہ صرف پیشوا بلکہ خود مرہٹہ قوم کے آئندہ اقتدار و ترقی کا انحصار اس پر تھا کہ جہاں تک ممکن ہو مرہٹہ سرداروں کی اندرونی تفریق پر ظاہری اتحاد و مصالحت کا پردا پڑا رہے

[۱] گرانٹ ڈف جلد اول صفحہ ۴۴۱ بحوالہ مراسلہ باجی راؤ

اور اس کی تدبیر یہی تھی کہ وہ بیرونی یا غیر طاقتوں سے جنگ وجدال میں مصروف رہیں، برار کا مرہٹہ حاکم رگھوجی بھونسلہ تو باجی راؤ کے بعد بھی پیشوا کی حکومت سے آزاد ہی رہا بلکہ اس کی جنگی قوت بڑھتی گئی اور چند حملوں کے بعد وہ بطور خود گونڈوانے اور اڑیسے کے اکثر اضلاع پر قابض ہو گیا، لیکن اکثر مرہٹہ سردار بیرونی لڑائیوں میں تیسرے پیشوا بالاجی یا اس کے سپہ سالار سداشیو (بھاؤ) کے ساتھ رہے اور اسی کے زمانے میں صوبۂ مالوہ کی چوتھ کی سند شاہی بھی مرہٹوں کو حاصل ہو گئی (۱۱۵۷ھ) جس کے واسطے باجی راؤ بہت روز تک جدوجہد کرتا رہا تھا؛

مرہٹوں کا دخل شمالی ہند میں

یہ سند محمد شاہ نے بالاجی کو اس خدمت کے صلے میں دی تھی کہ اس نے بنگالے پر رگھوجی بھونسلہ کی یورش روکنے میں بادشاہی صوبہ دار مرزا محمد علی وردی خاں کو فوجی مدد دی اور خود اپنے ہمقوموں سے لڑکر انھیں بنگالے سے خارج کر دیا، لیکن اس واقعے سے جہاں مرہٹوں کا اندرونی نفاق ظاہر ہوتا ہے اسی کے ساتھ دہلی کی صدر حکومت کی کمزوری بھی آشکارا ہے کہ وہ اپنے بعید صوبوں کو بچانے کے واسطے مرہٹوں کی دست نگر ہو گئی تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں محمد شاہ کے انتقال کے بعد تو خاص پایۂ تخت کے تنازعات میں وہ مدد کے واسطے طلب کئے جاتے تھے ادھر دکن میں انہی دنوں ایسے واقعات پیش آئے جن سے پیشوا کو مزید قوت اور شمالی ہند کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت حاصل ہو گئی ہ

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اوّل تو ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل نے انتقال کیا اور نواب ناصر جنگ کی سند نشینی کے ساتھ ہی کرناٹک میں وہ لڑائیاں چھڑ گئیں جن کی وجہ سے دکن کی یہ اسلامی طاقت عرصے تک اندرونی خلفشار میں مبتلا رہی اور مرہٹوں کو اس خطرناک ہمسائے کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہ رہا، دوسرے ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں راجہ ساہو نے لاولد وفات پائی اور ہر چند پہلے اس کی بیوہ اور بعد میں تارابائی نے بہت کچھ کوشش وسازش کی کہ اس موقع پر پیشوا کا زور توڑ دیا جائے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار بالاجی اپنے سب حریفوں پر غالب آگیا اور اس نے تارابائی کے پوتے رام راجا کو ساہو کا جانشین اور مرہٹہ حکومت کا برائے نام راجہ تسلیم کرا دیا پھر اس نے رگھوجی بھونسلہ کو بھی مصالحت سے اور داماجی گائیکوار کو شکست دیکر آخر میں اپنا ساتھی بنا لیا تھا اور اسی اندرونی انتظام کے بعد اب مرہٹے تازہ قوت کے ساتھ مالوے اور راجپوتانے کے علاقوں میں چوتھ وصول کر رہے تھے (کہ ۱۱۶۰ھ ۱۷۰...)

جنگ پانی پت اور اس کے نتائج

یہی زمانہ ہے جب کہ مرہٹوں کی روز افزوں طاقت سے غازی الدین ثالث (عماد الملک) کو فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور اس نے عالمگیر ثانی اور اس کے امیر الامرا نجیب الدولہ کے مقابلے میں مرہٹوں کو اپنی مدد کے واسطے طلب کیا اور اسی سلسلے میں وہ آدینہ بیگ خاں کی مدد کے نام سے پنجاب میں پہنچ گئے جس کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے یہ مرہٹوں کے انتہائی عروج کا وقت تھا اور بے شبہ اگر پنجاب پر قبضہ کر کے وہ احمد شاہ ابدالی سے جنگ مول نہ لیتے تو غالباً شمالی ہند کے دوسرے علاقوں پر بہت جلد اُن کا اثر قائم ہو جاتا، اسی طرح دکن میں ایک ہی معرکے نے اُن کو چیرہ دست کر دیا تھا (جنگ اودگیر ۱۱۷۳ھ ۱۷۶۰ء) اور نواب صلابت جنگ کو مجبور ہو کر نہ صرف خاندیس بلکہ دولت آباد و بیجاپور کے اقطاع بھی پیشوا کے حوالے کرنے پڑے تھے جو صوبہ دار دکن کی انتہائی کمزوری کی دلیل تھی۔ اگر ان کامیابیوں نے مرہٹہ سرداروں کے دل میں غرور و خود نمائی کے جذبات پیدا کر دیئے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی ملکی مقبوضات کے ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کے لوازم اور ساز و سامان میں بھی نمایاں اضافہ ہو رہا تھا۔ بے قاعدہ جرگوں اور رہزن گروہوں کے بجائے اب پیشوا کے تحت میں ایک باقاعدہ اور تنخواہ دار فوج تھی جس میں ابراہیم خاں گاردی کے وہ دس ہزار پیادے خاص طور پر مشہور ہیں جنھیں فرانسیسیوں کے طرز پر قواعد جنگ سکھائے گئے تھے اور جو اسی زمانے میں نواب صلابت جنگ کی ملازمت چھوڑ کر حکومت پونا[1] کے نوکر ہو گئے تھے اسی طرح پیشوا کے توپخانے میں اب اتنی توپیں تھیں کہ ہندوستان کی اور کسی طاقت کے پاس نہ ہوں گی ؛

بایں ہمہ جب اس جنگی قوت اور ساز و سامان کی سب سے بڑی آزمائش کا وقت آیا تو مرہٹوں کی نااہلی یا کہنا چاہیئے کہ اُس زمانے کے اہل ہند کی، نااہلی کا راز فاش ہو گیا کہ نہ ان میں جانباز و مستقل مزاج سپاہی تھے نہ ایسے کارداں سپہ سالار جو ایک دلیر و ہوشیار دشمن سے لڑ کر فتح حاصل کر لیتے۔ کم تعداد اور کم سامان افغانی حریفوں سے پانی پت کے میدان میں جو شکست اُنھوں نے کھائی وہ کئی اعتبار سے تاریخ میں اہل ہند کی سب سے بڑی شکست ہے جب رفتہ رفتہ اس کی تفصیلی خبریں دکن میں پہنچیں تو مرہٹی علاقوں میں بہ مشکل کوئی گاؤں ایسا ہو گا جہاں پانی پت کے مقتولین کا ماتم بپا نہ ہو گیا ہو، خود پیشوا کی نسبت عام خیال ہے کہ اسی قومی مصیبت اور

[1] مرہٹوں کا برائے نام راجہ ستارا کے محلات ہی میں نظر بند رہا لیکن ۱۱۶۳ھ ۱۷۵۰ء سے پیشوا کا مستقر یعنی اصلی دار الحکومت پونا بن گیا تھا ؛

جوان بیٹے وسواس راؤ کے غم نے جو اس لڑائی میں مارا گیا تھا اس کی جان لی اور وہ جنگ پانی پت کے چند مہینے بعد مرگیا (۱۷۶۱ء؛ ۱۱۷۴ھ) نیز یہی شکست تھی جس نے مرہٹوں کے سیلاب کو عین طغیانی کے وقت شمالی ہند میں بڑھنے سے روک دیا اور کم سے کم چند سال کے واسطے چنبل کے شمال میں ان کی حکومت کا نشان باقی نہ رہا۔

لیکن اس شدید نقصان و ذلت کے باوجود یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پانی پت کی اس لڑائی نے مرہٹوں کی قوت بالکل توڑ دی۔ اس کے برخلاف ہم انھیں آئندہ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے طاقتور پاتے ہیں، اپنے ملکی حریفوں سے ان کے دبنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ ایک بیرونی دشمن سے شکست کھائی تھی جو فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سے واپس چلا گیا، اور پانچ سات برس کے بعد ہی مرہٹہ سوار چنبل اتر کے پھر متھرا و آگرے کی نواح میں نظر آنے لگے اور جب مغل بادشاہ شاہ عالم (ثانی) مشرقی صوبوں سے مایوس و ناکام اپنے پائے تخت میں واپس آیا (۱۷۷۱ء؛ ۱۱۸۵ھ) تو روہیلکھنڈ اور شمال مشرقی راجپوتانے کے سرکشوں کو زیر کرنے میں اسے مرہٹوں ہی سے مدد ملی جن کو رفتہ رفتہ دربار دہلی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہو گیا اور آخر میں سندھیا کے ذریعے پیشوا کو تمام ہندوستان میں بادشاہ کی نیابت کی سند حاصل ہو گئی (۱۷۸۴ء؛ ۱۱۹۸ھ)

مگر ظاہر ہے کہ یہ سند یا فرمان شاہی عملاً کچھ زیادہ وقیع نہ تھا۔ بے شبہ ہندوستان میں مغل بادشاہ کا ابھی تک سب لوگ ادب و احترام کرتے تھے اس کے اجداد نے اہل ہند میں سیاسی اتحاد کا جو احساس پیدا کر دیا تھا اس کا فطری مقتضی تھا کہ ان کی آنکھیں تمام ممالک ہند کا کوئی مرکز واحد تلاش کریں اور یہ مرکز اگر کہیں نظر آتا تھا تو وہ اسی مغل بادشاہ کی ذات تھی[1] لیکن سیاسی دنیا میں عمدہ جذبات اور محض رسمی اطاعت سے کوئی حکومت نہیں چلتی، شاہ عالم کی براہ راست حکومت صرف مغربی دوآب۔ روہیلکھنڈ، شمالی مشرقی راجپوتانہ۔ غرض دلی سے تقریباً دو دو سو میل کے فاصلے تک محدود تھی۔ اور اس میں بھی روہیلے اور جاٹ جابجا بغاوت و سرکشی کرتے رہتے تھے۔ ستلج کے اوپر پنجاب کا صوبہ پہلے ہی افغانوں کے تحت میں آگیا تھا اور جب ان سے چھٹا تو وہاں

[1] سندھیا کا مشہور جرنیل دبوئنی شہادت دیتا ہے کہ اگرچہ تمام جنوبی ہند شاہ عالم کی حکومت سے آزاد ہو چکا تھا لیکن ہنوز اس کا اتنا اثر باقی تھا کہ ہندوستان بھر میں کسی رئیس و راجہ کو علانیہ "بادشاہ" کا لقب اختیار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ (لائف سندھیا، مرتبہ کین صفحہ ۹۷)

سکھوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ مشرقی دوآبے میں والیِ اودھ کی حکومت تھی اور اس کا بادشاہ سے بس اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا کہ اب تک اس کا سرکاری لقب "نواب وزیر" تھا ورنہ حکومت کے اندرونی انتظام میں اس کو بالکل آزاد سمجھنا چاہیے۔ باقی جنوب میں مدت سے مغل بادشاہ کی سرحد دریائے چنبل بن گیا تھا جس کے آگے مرہٹوں یا مقامی رئیسوں کا راج تھا۔

مرہٹہ قوت کا زوال انتشار

الغرض، ایسے بادشاہ سے اگر نیابت کی سند ملی بھی تو وہ کچھ بہت مفید مطلب نہ ہو سکتی تھی، دوسرے یہ سند جو پیشوا کے نام پر حاصل کی گئی تھی اس سے جو کچھ نفع ممکن تھا وہ خود مادھوجی سندھیا اٹھانا چاہتا تھا، اور گو دربارِ دہلی میں وہ اپنے آپ کو پیشوا کا ماتحت و قائمقام ظاہر کرتا تھا مگر درحقیقت حکومت پونا سے اس کا یہ تعلق محض سیاسی اور ذاتی اغراض پر مبنی تھا ورنہ بجائے خود اس کے مختارِ کامل ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی، شمالی مالوے اور نواحِ دہلی میں جو مرہٹہ عامل اور مرہٹہ فوجی دستے متعین تھے وہ بھی براہِ راست سندھیا ہی کے ملازم تھے اور حکومت پونا کو ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ گدی کے اصلی وارث کو بیکار بنا کے برہمنوں کا حکومت پر قابض ہو جانا، مرہٹہ ریاست کی بنیادی کمزوری تھی اور دوسرے پیشواہی کے زمانے میں اس کے بُرے نتائج کا ظہور ہونے لگا تھا لیکن بالاجی پیشوا کی وفات کے بعد جب اُس کے بھائی رگھوناتھ راؤ یا رگھوبا نے حکومت پر خود قبضہ جمانا چاہا اور اس میں اور بالاجی کے بیٹوں میں کشاکش ہوئی تو پیشوا کے رہے سہے اقتدار میں بھی کمی آنے لگی اور چوتھے پیشوا کے بعد یہی خانگی نزاع سخت نقصان رساں بن گئی اور مرہٹوں کے مختلف طاقتور سردار پونا کی مرکزی حکومت سے قریب قریب آزاد ہوگئے، اس طرح سچ پوچھیے تو مادھو راؤ (چوتھے پیشوا) کے مرتے ہی (۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء) مرہٹہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا[۱] اور گو ابھی تک

[۱] اس جگہ پیشواؤں کا شجرۂ نسب پیش نظر رکھنا مفید ہوگا:—

(۱) بالاجی وشوناتھ

(۲) باجی راؤ (۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء تا ۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء)

(۳) بالاجی راؤ (تا ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء)

(۶) رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) تا ۱۲۳۴ھ / ۱۷۸۲ء

وسواس راؤ — (۴) مادھو راؤ (تا ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء) — (۵) نرائن راؤ (تا ۱۱۸۷ھ)

(۷) مادھو راؤ نرائن (تا ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء) — (۸) باجی راؤ (معزولی ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء)

حکومت پونا کی بیرونی لڑائیوں میں دوسرے مرہٹہ سردار بھی شریک و مددگار ہوجاتے تھے لیکن اول تو اس امداد میں اگر خودغرضی نہیں تو خودمختاری کی شان ضرور تھی دوسرے خود مرکزی حکومت میں یہ قوت و قابلیت نہ رہی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں تمام مرہٹہ رئیسوں کو متحد و متفق رکھ سکتی۔ لہٰذا جب تک اس کا مقابلہ ہندوستانی حریفوں سے رہا جو اس سے بھی زیادہ غیر مستقل اور زوال پذیر تھے، اس وقت تک حکومت پونا ظاہرا بہت اچھی حالت میں رہی لیکن جب ایک تیسری اور تازہ دم بیرونی قوت سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئی جس کی کامیابی کا انحصار ہی اہلِ ہند کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھانے پر تھا، تو مرہٹوں میں سب سے پہلے حکومتِ پونا ہی زد میں آئی اور اُسنے نقصان اٹھایا اور پھر ایک ایک کر کے دوسرے مرہٹہ رئیس بھی مغلوب و سرنگوں ہوتے گئے۔

مرہٹوں کے زوالِ قوت کا دوسرا قوی سبب جسے ان کی تاریخ کے مشہور مصنف گرانٹ ڈف نے جا بجا جتایا ہے [۱] یہ تھا کہ ابتدا سے ان کی سپاہگری قزاقانہ قسم کی تھی اور اسی طرز جنگ کے لیئے وہ طبعاً موزوں تھے جس میں نہ کسی باقاعدہ اور منتظم فوج کی ضرورت ہے اور نہ کسی فن حرب کے ماہر سپہ سالار کی۔ پس جب تک وہ دوسروں کے علاقے پر تاخت تاراج کرتے رہے ان کا زور رہا۔ لیکن جب یہ دوسری قوتیں اندرونی اسباب اور کچھ مرہٹوں کی یورشوں سے کمزور ہوکر معدوم ہوگئیں اور ان کے علاقوں پر مرہٹوں کا تسلط ہوا تو پھر انھیں قزاقی کی بجائے ریاست و حکومت کی شان بنانی پڑی، باقاعدہ فوجیں اور توپ خانے رکھنے پڑے اور یہ وہ پابندیاں تھیں جن سے مرہٹہ قوم کو کوئی مناسبت نہ تھی چنانچہ جہاں جہاں اِن کی مستقل حکومت قائم ہوئی وہاں شاید دو نسلیں بھی نہ گزری تھیں کہ ان کی فوجوں میں مرہٹہ عنصر کم ہوگیا تھا کہ ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۹ء) ہی میں پونا سے جو فوج آراستہ ہوکر شمال کی جانب روانہ ہوئی اس کے پیادوں اور توپ خانے میں کوئی مرہٹہ سپاہی نہ تھا اور سواروں میں بھی وسط ہند کے بہت سے پنڈارے شامل تھے [۲]۔ اسی طرح مادھوجی سندھیا جس نے مرہٹوں میں سب سے زیادہ قوت حاصل کر لی تھی اور جو توپ و تفنگ کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا، غیر مرہٹہ فوجیوں کا محتاج ہوگیا تھا، اس کے بہترین سپہ سالار بھی غیر قوم بلکہ غیر ملک کے لوگ تھے، اور ان میں دو فرانسیسی سردار، دبوئنی اور پیران خاص طور پر مشہور ہیں۔

۲ - حیدرآباد، (میسور)

---

[۱] مثلاً۔ دیکھو گرنٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔

[۲] "سندھیا" مولفہ کین صفحہ ۵۶۔

خاندان آصف جاہی

اس انقلاب عظیم کے وقت، جب کہ سلطنت مغلیہ کی پُرشکوہ عمارت گر رہی تھی اور مرہٹوں کی غارتگری نے سارے ملک میں تہلکہ ڈال دیا تھا، اُن کے ہمسائے میں دکن خاص کے علاقوں کا محفوظ و مصئون رہنا خاندانِ آصف جاہی کی حیرت انگیز قابلیت و مستعدی کا ثبوت ہے ۔

یہ نامور خاندان شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہے اور اس کے جدامجد خواجہ عابد "کہ پدرش عالم شیخ از عظمائے اکابر سمرقند... بود" عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے اور عہد اورنگ زیب میں قلیچ خاں کے خطاب اور منصب چہار ہزاری سے مفتخر ہوئے، چند سال بعد ان کے فرزند میر شہاب الدین اور بھائی خواجہ بہاء الدین بھی ہندوستان چلے آئے اور سلطنت کے نہایت معزز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے۔ تاریخ میں میر شہاب الدین اپنے شاہی خطاب "غازی الدین فیروز جنگ" سے مشہور ہیں ۔

دکن سے ابتدائی تعلق

دربار اورنگ زیب کے ان گرامی قدر امیروں کے تفصیلی حالات ہمعصر تواریخ میں جستہ جستہ اور مآثر الامرا میں یکجا موجود ہیں لیکن اس مختصر کتاب میں بھی یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بیجاپور اور گولکنڈے کی فتوحات میں یہ دونوں سردار بادشاہ کے سب سے عزیز و محترم رفقا میں تھے اور بیجاپور کی فتح کا جو اطلاع نامہ دفتر شاہی سے شایع ہوا اس میں قدر شناس بادشاہ نے یہ فقرہ اپنی قلم سے تحریر کیا تھا کہ بیجاپور... "بدستیاری فرزند بے ریو ورنگ غازی الدینخاں بہادر فیروز جنگ مفتوح شد"، اسی طرح گولکنڈے کے محاصرے میں سپہ سالاری کے فرائض نواب قلیچ خاں کے تفویض کودیئے گئے تھے اور انھوں نے یہیں گولے کے زخم سے انتقال کیا (۱۰۹۷ھ) اورنگ زیب کو اس واقعے کا نہایت ملال ہوا، مرحوم کی اولاد مزید اعزاز و اکرام شاہی سے مفتخر ہوئی مگر حق یہ ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے اس جانثاری کا جو صلہ ملا وہ تمام بادشاہی انعامات سے بڑھ چڑھ کر تھا کیونکہ بادشاہ کے حکم سے جب محاصرین اپنے مرحوم سپہ سالار کی نعش کو لشکرگاہ کے قریب دفن کر رہے تھے[1] تو یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ وہ درحقیقت دکن میں اسی بہادر امیر کے خاندان کی آیندہ فرمانروائی کی بنیاد جما رہے ہیں ۔

نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل

اسی موقع پر مرحوم کے نوجوان پوتے میر قمر الدین کو منصب چہار ہزاری اور چین قلیچ خاں بہادر کا خطاب عطا ہوا اور آیندہ کارناموں کے صلے میں مزید ترقی ہوتی رہی لیکن میر قمر الدین کی فراست و تدبر کی آزمایش کا سبب سے نازک وقت وہ تھا جب کہ سادات بارہہ فرخ سیر کو معزول و مقتول

[1] یہ تاریخی مقبرہ حیدرآباد و گولکنڈے کے درمیان آصف نگر میں موجود ہے ۔

کرنے کے بعد حکومت کے قریب قریب مالک بن بیٹھے تھے اور سلطنت مغلیہ کے قدیم اُمرا کا ہر حیلے سے استیصال کر رہے تھے۔ ان سیدوں کی شکست و زوال کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ مغل بادشاہ کو میر قمرالدین خاں کی شجاعت و قابلیت اور اسی خاندان کے دوسرے رکن محمد امین خاں پسر خواجہ بہاءالدین کی سعی و کوشش نے بادشاہ گر سیدوں سے مخلصی دلائی تھی اور آئندہ بھی یہ خاندان سلطنت کی جس خلوص و لیاقت کے ساتھ خدمت گزاری کرتا رہا، اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں حتیٰ کہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ محمد شاہ کو اپنے طویل عہد حکومت میں جب کبھی مصائب نے خواب عشرت سے بیدار کیا تو انتہائی پریشانی کے وقت میں اسی خاندان کے افراد خاص کر نواب میر قمرالدین خاں سلطنت کے واسطے سینہ سپر ہو گئے۔ محمد شاہ کی جانب سے اس خدمت و جانسپاری کا اگر کوئی قابل یادگار صلہ ملا تو وہ صرف خطاب آصف جاہ تھا (۱۱۴۷ھ) ورنہ اس بادشاہ نے اپنے کم عقل اور حاسد امیروں کے اغوا سے بارہا نواب موصوف کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور گجرات و مالوے کی طرح دکن کے صوبوں کو بھی آصفجاہ سے لے لینے کی درپردہ کوششیں کیں؛

یہ کوششیں خود سلطنت کے لئے موجب نقصان تھیں، خیر خواہی اور وفاداری کے باوجود نواب نظام الملک کو دہلی کی ناقدر دان حکومت کے حاسدانہ احکام کی تعمیل میں دکن سے دست بردار ہونا گوارا نہ تھا اور کچھ عرصے کے واسطے حفاظتِ ذاتی کی بدولت بادشاہ کا نواب نظام الملک پر عتاب بھی ہوا، لیکن آخر میں محمد شاہ کو اپنے بہترین امیر کی مخالفت سے پشیمانی ہوئی اور بادشاہ کی پریشانیاں دیکھکر نواب آصفجاہ نے بھی گذشتہ شکایات بھلا دیں اور اڑے وقت میں رفاقت و جانبازی کے لئے پھر دہلی آنا منظور کر لیا (۱۱۴۹ھ) لیکن پچھلے دس بارہ برس میں گجرات و مالوہ مرہٹوں کی آماجگاہ بن گئے تھے بادشاہ کا خزانہ خالی اور فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ لہٰذا اب مذکورۂ بالا صوبوں سے مرہٹوں کے اخراج میں نواب آصف جاہ کی مساعی بھی کارگر نہ ہو سکیں اور مالوے کی چند ہفتے کی لڑائی میں چار و ناچار باجی راؤ سے دب کر صلح[۱] کرنی پڑی (اقرار نامہ بھوپال ۱۱۵۰ھ، ۱۷۳۸ء)

جیسا کہ صاحب مآثرالامرا نے تصریح کی ہے، مرہٹوں سے اس موقع پر جس طرح ممکن ہو پیچھا چھڑانے اور ان کی من مانی شرائط قبول کر لینے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انہی دنوں

[۱] یہ وہ مصالحت نہیں ہے جس کا پہلے ذکر آیا ہے اور جس کا زمانہ ۱۱۴۲ ہجری تھا۔

نادر شاہ کی آمد آمد کی خبر گرم تھی[۵۱]، اور حکومتِ دہلی سے مطلق امید نہ تھی کہ بطور خود اس نئے خطرے کا تدارک کر سکے گی پس نواب آصف جاہ کو جلد سے جلد مالوے سے واپس آنا پڑا اور نہ صرف کرنال کے میدان میں جنگی مدافعت بلکہ حملہ آوروں سے بعد کی مصالحت بھی درحقیقت زیادہ تر آصفجاہ کی سعی و تدبیر کا نتیجہ تھی جس کی خود نادر شاہ نے داد دی تھی[۵۲]۔

مرہٹوں کو تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہوگیا تھا کہ بھوپال کے اقرار و مدار محض دفع الوقتی کیواسطے تھے جن کے ایفا کی کوئی امید نہ تھی[۵۳]، لہٰذا انھوں نے اس مرتبہ دکن کے علاقوں پر یورش کی جہاں آصف جاہ کا منجھلا فرزند، میر احمد ناصر جنگ، نائب صوبہ دار تھا اور فوج کا بڑا حصہ دہلی گیا ہوا تھا، دکن کو گجرات کی طرح تاراج کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا لیکن ناصر جنگ کی دلیرانہ مدافعت نے مرہٹوں کی ہمت پست کردی اور انہیں مالی زیرباری اور نقصان کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا (۵۲-۱۱۵۱ھ) اور ادھر کچھ عرصے بعد خود نواب آصف جاہ نے دکن پہنچ کر عنانِ انتظام اپنے ہاتھ میں لی۔

اندرونی نظم و نسق

نواب آصف جاہ کے باقی ایامِ زندگی دکن ہی میں بسر ہوئے، یہاں پہنچتے ہی اول تو ناصر جنگ نے باپ سے سرکشی کی لیکن لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور قدردان باپ نے نہ صرف جان بخشی کی بلکہ بہادری کی داد دی، پھر نواب آصفجاہ نے ملک ارکاٹ کی تسخیر پر توجہ کی جس کے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور کچھ مقامی رئیسوں کی سرکشی سے صوبہ دار دکن سے منحرف ہوگئے تھے آصف جاہی افواج نے ترچناپلی تک (جس پر مرہٹے قابض تھے) تمام اضلاع کو از سرِ نو فتح کیا،

سنہ ۵۱ مآثر الامرا - جلد سوم ۸۴۵۔

سنہ ۵۲ اہل دہلی اپنے ہر دلعزیز و محترم نواب آصفجاہ کی آمد سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوئے تھے اسکی شہادت میں یہ مشہور قطعۂ تاریخ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ:-

صد شکر کہ ذاتِ دیں پناہی آمد رونق دہِ ملکِ بادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف گفت، "آیتِ رحمتِ الٰہی آمد"

سنہ ۵۳ اس حقیقت کو خاص طور پر جتانے کی ضرورت ہے کیونکہ ڈف اور دیگر انگریز مورخ مذکورۂ بالا جنگ اور مصالحت کو مرہٹوں کے کامل غلبے کا ثبوت بتاتے ہیں حالانکہ خود ان کے آیندہ بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ باجی راؤ کی یہ کامیابی محض عارضی اور نواب آصف جاہ کی وقتی مشکلات کا نتیجہ تھی۔

(۱۱۵۵ھ ۱۷۴۲ء) پھر یہاں کی حکومت (یا نظامت) **انورالدین خاں** کے تفویض کر کے نواب آصفجاہ نے اورنگ آباد کو مراجعت کی۔

آصف جاہ اوّل
کے جانشین

آصف جاہ اوّل نے برہانپور میں انتقال کیا (جمادی الآخرہ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) اور دو بیٹیاں اور چھ فرزند چھوڑے جن میں سے ایک نواسے اور چار بیٹوں نے کم سے کم رسمی طور پر مرحوم کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ لیکن ان واقعات کو پڑھتے وقت مناسب ہے کہ خاندان آصف جاہی کے مشاہیر کا شجرہ پیش کر دیا جائے :-

خواجہ عابد قلیچ خاں

میر شہاب الدین المخاطب بہ غازی الدین خاں (اوّل)

میر قمرالدین نظام الملک آصف جاہ (اوّل)

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ (ثانی) — عماد الملک غازی الدینخاں (ثالث) وزیر دہلی

(میر احمد) ناصر جنگ

(میر محمد) صلابت جنگ

(میر نظام علی) نظام الملک آصفجاہ (ثانی)

(میر محمد شریف) بسالت جنگ

خجستہ — میر ہدایت محی الدین مظفر جنگ

نواب سکندر جاہ " " ثالث

نواب ناصر الدولہ " " رابع

نواب افضل الدولہ " " خامس

نواب میر محبوب علیخاں " " سادس

اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و دولتہٗ

آصف جاہ اوّل کا فرزند اکبر نواب غازی الدین خاں باپ کی طرف سے نیابتہً دربار دہلی میں امیر الامرا تھا اور دکن میں ضرورت کے وقت یہ خدمت دوسرا بھائی نواب ناصر جنگ انجام دے چکا تھا اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت مسلّم تھی اور باپ کے انتقال کے بعد وہی **نظام الدولہ ناصر جنگ** کے خطاب سے مسند صوبہ داری پر متمکّن ہوا، پھر اسی زمانے میں جب **احمد شاہ** ابدالی کے حملے کے وقت دربار دہلی سے طلبی ہوئی تو وہ فوج لیکر دکن سے روانہ ہوا تھا کہ ادھر تو بادشاہ نے فسخ عزیمت کی ہدایت کی اور ادھر اس کے بھانجے ہدایت محی الدینخاں نے خود دکن میں علم سرکشی بلند کیا۔ اس نوجوان امیر زادے کو نواب آصفجاہ اول کی جانشینی کا دعوے تھا اور **چندا صاحب** اور ڈوپلے جیسے سازشی رفیق مل گئے تھے، چندا صاحب اصلی نام

حسین دوست خاں ہے اور وہ کرناٹک یا ارکاٹ کے ان مقامی (نوائت) رئیسوں کا سر گروہ تھا جنھیں آصف جاہ اول نے بے دخل کر کے انور الدین کو وہاں کا ناظم بنا دیا تھا۔ اور دوپلے دکن میں اہل فرانس کی تجارتی کوٹھیوں کا صدر عامل یا گورنر تھا جنھوں نے تقریباً نصف صدی پہلے ساحل کورومنڈل پر ایک گاؤں (پھیل جیری) خرید کر اسے اپنا صدر مقام اور سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ بنا لیا تھا، یہی جگہ تاریخ میں پانڈی چیری (یا پان دی شیری[1]) کے نام سے مشہور ہے

جنگلگ نامہ

فرنگی سوداگروں کے ہندوستان آنے اور ملک گیری کا منصوبہ سوچنے کے حالات آئندہ باب میں یکجا ہماری نظر سے گزریں گے، اس جگہ یہ لکھنا کافی ہے کہ دوپلے پہلا فرنگی ہے جس نے اہل ہند کی کمزوریوں کو تاڑا اور انھیں آپس میں لڑا کر خود حکومت قائم کرنے کا وسیع و پیچیدہ جال تیار کیا تھا۔ اس سازش میں چندا صاحب کو تو فرانسیسیوں کے ساتھ برابر کا شریک سمجھنا چاہیے لیکن جو صید غافل سب سے پہلے اس جال میں پھنسا وہ ہدایت محی الدین خاں المخاطب بہ مظفر جنگ ہے۔ شرکاء سازش کو شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے انور الدین خاں ناظم کرناٹک پر حملہ کیا اور وہ اتفاق سے پہلی ہی جنگ میں مارا گیا (۱۱۶۲ھ) ملک پر یہ "اتحادی" قابض ہو گئے۔ لیکن ابھی وہ خوشیاں ہی منا رہے تھے کہ نواب ناصر جنگ نے فوج کثیر کے ساتھ اورنگ آباد سے کوچ کیا اور سازش کے اصلی مرکز یعنی پانڈی چیری کے قریب تک آپہنچا، صوبہ دار دکن کی اس یلغار نے اتحادیوں میں ہل چل ڈال دی۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے تمام رفیق سمٹ کر پانڈی چیری سے کچھ فاصلے پر جمع ہو گئے اور فرانسیسی سپاہ کی بہت بڑی تعداد ان کی امداد کے واسطے آئی۔ فرنگی سپاہی، جن کی قواعد دانی اور بہادری کی بے سروپا تعریف سے جدید تواریخ ہند کے ورق سیاہ نظر آتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو ایشیا میں در اصل اکثر موقعوں پر فریق مقابل کی باہمی نااتفاقی اور غداری سے لڑائیاں جیتی ہیں اور اس موقع پر بھی دوپلے برابر سازباز میں مصروف تھا لیکن اس ریشہ دوانی کا کوئی نتیجہ نکلنے نہ پایا تھا کہ فرنگی سپاہیوں نے محض مرعوب ہو کر ایک رات بغیر کسی بڑی لڑائی کے فرار اختیار کیا اور کمال بزدلی سے اپنے رفیق مظفر جنگ کو تنہا چھوڑ گئے جو صبح کو معمولی زد و خورد کے بعد گرفتار کر لیا گیا[2] (ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ، ۱۷۵۰ء)

فرانسیسی فتح؛ دربار دکن میں

مگر اُورم لکھتا ہے کہ مذکورۂ بالا ناکامی کے باوجود مکار دوپلے اس بات سے مایوس نہ ہوا تھا کہ

---

[1] ماثر الامرا جلد سوم صفحہ ۵۲۰۔ [2] آورم جلد اول صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰۔ مے لیسن صاحب نے حسب دستور ان واقعات کے بیان کرنے میں بہت سی تاویلات پیش کی ہیں "ہسٹری آف دی فرنچ ان انڈیا" صفحہ ۲۴۸ وغیرہ۔

نواب ناصر جنگ کے دربار میں کسی نااتفاقی کا پتہ لگا لیگا یا خود کوئی ایسا نفاق پیدا کر دیگا جس سے عیاری کے ساتھ اپنا کام نکل آوے اور دوبارہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے بگڑے ہوئے معاملات کی اصلاح ہو سکے“ اس کا خیال صحیح نکلا، چند ہی دنوں کی ریشہ دوانی سے نواب کے چند پٹھان امیر دوپلے سے مل گئے اور انہی غداروں کی تحریک سے فرانسیسیوں نے نواب کی فوج پر شبخون مارا۔ جب ناصر جنگ ہاتھی پر سوار ہو کر خود سپاہیوں کی ہمت بندھانے نکلا اور ان پٹھانوں کی طرف بھی آیا تو ان میں سے ایک پٹھان امیر (ہمت خاں نامی) نے اپنے آقا ناصر جنگ کے گولی لگائی اور جونہی وہ مر کر ہاتھی سے نیچے گرا فوراً اس کا سر کاٹ لیا۔ (۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء)

اہل سازش نے اسیوقت مظفر جنگ کو قید سے نکال کر مسندِ دکن پر بٹھا دیا تھا اور جب وہ بھی تھوڑے دن بعد باہمی نفاق و شورش کا شکار ہوا تو نواب آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا جو مظفر جنگ کی طرح فرانسیسیوں کی طرف مائل تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ فرانسیسی فوج کے سردار موسیو بوسے (بوسی) کو دربار دکن میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ اُس نے ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانے میں جانبازی اور قابلیت بھی دکھائی، یہ بیرونی حملے مرہٹوں نے کیئے تھے لیکن انھیں اصلی قوت و تحریک نواب غازی الدین خاں (ثانی) سے پہنچ رہی تھی جو اپنے باپ نواب آصف جاہ اول کی وراثت کا دعویدار تھا اور صوبہ داری دکن کی سند لے کر دہلی سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا، اُس نے اپنی مدد کے معاوضے میں مرہٹوں کو ملک خاندیس دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کی آمد سے پہلے مرہٹہ حلیفوں نے صلابت جنگ سے لڑائی چھیڑ دی تھی لیکن اول تو یہ حملے چنداں کارگر نہ ہوئے اور ادھر نواب غازی الدینخاں کا اورنگ آباد پہنچتے ہی انتقال ہو گیا پس یہ جھگڑا جس کی نسبت خوف تھا کہ سخت خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے گا ایک ہی سال میں رفع دفع ہو گیا (۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) اور اس اثناء میں فرانسیسیوں کو دربار میں مزید قوت حاصل ہو گئی، سال آئندہ جنوبی اڑیسہ کے چار بڑے بڑے اضلاع[۱] کی سند بھی انھیں مل گئی جو فوجی مصارف کے لیئے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے اور جن کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ تقریباً چالیس لاکھ روپیہ کیا جاتا تھا۔

امرائے دکن کی خود غرضی اور باہمی نااتفاقی نیز فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے آئندہ پانچ سات برس تک ملکِ دکن کی حالت میں بہت ابتری رہی مگر اسی بدنظمی نے خاندان آصف جاہی کے سب سے بہتر فرد کو

نواب نظام علیخاں، آصفجاہ ثانی

سلہ[۱] یعنی سرکار ہائے مصطفےٰ نگر، ایلور، راجمندری اور چکاکول جو اب ”شمالی سرکاروں“ کے نام سے احاطۂ مدراس میں شامل ہیں۔

سند فرمانروائی پر پہنچنے کا موقع دیا اور کچھ عرصے دیوان رہنے کے بعد نواب میر نظام علیخاں نے نظام الدولہ آصفجاہ ثانی کے خطاب سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی (۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء)

واضح رہے کہ نواب صلابت جنگ کی کمزوری اور غیر ہردلعزیزی کی سب سے آخری اور قوی وجہ وہ لڑائی ہوئی تھی جس میں مرہٹوں نے اُسے اودگیر کے قریب گھیر کر خاندیس و برار، نیز دولت آباد و بیجاپور کے وسیع علاقے دینے پر مجبور کر دیا تھا (۱۱۷۲ھ)، لہذا نواب میر نظام علیخاں بہادر کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ جس طرح ہو سکے اس نقصان کی تلافی کی جائے اور پانی پت میں مرہٹوں کی سخت ہزیمت نے کامیابی کا خداداد موقع دے دیا تھا۔ چنانچہ آیندہ دو تین سال تک مرہٹوں سے برابر جنگ ہوتی رہی جسمیں نواب نظام الدولہ بہادر کی فوجوں نے ایک مرتبہ خاص پونا تک بڑھکر اس شہر کو جلا دیا (۱۱۷۶ھ) اور اس کے جواب میں مرہٹوں کی اورنگ آباد و حیدرآباد پر یورش ناکام رہی۔ آخر نصف سے زیادہ کھویا ہوا علاقہ لے کر نواب نظام الدولہ بہادر نے مرہٹوں سے صلح کرلی۔

انگریزوں سے تعلقات

اس مصالحت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اب انگریز نہ صرف اپنے فرانسیسی حریفوں پر غالب آگئے تھے بلکہ بنگال و ارکاٹ میں بھی ان کا عمل دخل ہوتا جاتا تھا اور اسی زمانے میں شاہ عالم (ثانی) سے بالا ہی بالا انھوں نے شمالی سرکاروں کا فرمان لے کر اس علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اس کارروائی کی حیدرآباد میں اطلاع ہوئی تو نواب نظام الملک کو نہایت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو جبراً اس علاقے سے خارج کر دیا جائے لیکن پلاسی کے فاتح ابھی ہر میدان میں کودنے کے لیئے تیار نہ تھے انھوں نے دب کر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراج گزاری کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کر لیا اور ان شرائط پر نواب نظام الملک نے وہ سرکاریں انھیں کے قبضے میں رہنے دیں[1] (۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۶ء) باایں ہمہ انگریزوں نے یہ روپیہ کئی سال تک ادا نہیں کیا اور مختلف عذرات کی بنا پر لیت و لعل کرتے رہے نیز نواب نظام الملک کی میسور سے جنگ چھڑی تو اس میں حسب معاہدہ امدادی فوج بھی نہ بھیجی۔ حالانکہ چند سال بعد جب خود ان کو ٹیپو سلطان سے جنگ پیش آئی تو اس میں حیدرآباد کی سپاہ برابر کی شریک تھی اور تاوانِ جنگ اور مفتوحہ علاقے میں اس ریاست کو بھی قریب قریب برابر کا حصہ ملا (محاربات میسور ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء تا ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء) لیکن اس متحدہ جنگ و فتح کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکومت پونا سے نواب نظام الملک کی پھر لڑائی چھڑ گئی اور بیدر کے قریب عین معرکۂ جنگ میں بعض غداروں نے دغا دی۔ نواب نظام الملک کو

---

[1] دیکھو "ہسٹوریکل اینڈ ڈسکرپٹو اسکیچ۔۔۔ نظامز ڈومی نینز"، صفحہ ۸۸، نیز آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۵۸۔

ہٹ کر قلعۂ کھرڑلا میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور مرہٹوں کے حسب منشا شرائط تسلیم کرنی پڑیں (۱۲۰۹ھ)
اس موقع پر بھی انگریزوں نے معاہدات کے خلاف کوئی کمک نہ بھیجی پس نواب نظام الملک نے انکی امدادی فوج
متعینہ حیدرآباد کو برطرف کردیا[۵۱]

ان واقعات نے نواب نظام الملک کو دوبارہ فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو جدید قواعد و اسلحہ جنگ
سے آراستہ کرنے پر آمادہ کیا اور چند ہی سال کی کوشش میں حیدرآباد میں ایک اعلیٰ درجے کی فوج مرتب
ہوگئی جو جدید ترین آتشی اسلحہ سے مسلح تھی اور جس کی جنگی ضروریات کے لیئے خود حیدرآباد میں توپ و
بندوق ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے تھے ان کارخانوں کی غالباً ہندوستان بھر میں نظیر
نہ تھی اور ان کے ساختہ اسلحہ کی ہمعصر انگریزوں نے جابجا تعریف کی ہے کہ وہ یورپ کے بہترین اسلحہ
سے کسی طرح کم پایہ نہ تھے[۵۲]

حیدرآباد کی جدید قواعد داں فوج کو موسیو ریمون اور پیراں جیسے لائق و کارداں فرانسیسی سردار
مل گئے تھے جنھوں نے مختلف معرکوں میں اپنی رفاقت و سپہ سالاری کے جوہر دکھا کر دربارِ دکن میں نہایت
ہردلعزیزی حاصل کرلی تھی اور ولیعہد ریاست (نواب سکندر جاہ) نیز دیگر امرا ریمون کے بڑے قدرداں
تھے لیکن یہاں خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ یہ فرانسیسی ملازمین ڈوپلے کے پہلے
فرستادوں کی طرح ریاست حیدرآباد کے دربردہ دشمن نہ تھے کہ اپنے قومی فوائد یا ملک ستانی کے لیئے
ریاست کو کمزور و بے قابو کرنے کی سازشیں کرتے۔ لہذا ان سے نواب نظام الملک کی قوت کو کوئی نقصان
پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا لیکن حیدرآباد کا بجائے خود ایک قوی ریاست بن جانا اور وہاں فرانسیسیوں کی موجودگی
ان کے قومی رقیب انگریزوں کو گوارا نہ ہوسکتی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور جب
ریمون نے وفات پائی (۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء) تو انھوں نے یک بہ یک حیدرآباد کی جدید سپاہ کو گھیر کر ہتیار
رکھوا لیئے اور اس ایک ہی چال میں نواب نظام الملک کی جنگی قوت کو ایسا نقصان پہنچا دیا کہ ونسنٹ اسمتھ کے
قول کے بموجب پھر انگریزوں کو نہ ریاست حیدرآباد کی دشمنی کا خوف رہا نہ دوستی کی تمنا[۵۳]۔ غرض اس طرح
ریاست کی خودمختاری میں روز بروز کمی ہوتی گئی اُدھر انگریزی مقبوضات اور جنگی قوت میں برابر اضافہ ہورہا تھا۔
حتیٰ کہ ہندوستان کی اور ریاستوں کے ساتھ ریاست حیدرآباد بھی رفتہ رفتہ اُن کی سیادت

---

۵۱ ہسٹوریکل اینڈ ڈس کرپٹو اسکیچ ...... نظام ڈومی نیز، صفحہ ۹
۵۲ ہسٹوریکل اینڈ ڈس کرپٹو اسکیچ ...... نظام ڈومی نیز، صفحات ۸ و ۹ و ۱۰۳
۵۳ اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۵۸۲ - نیز دیکھو ہسٹوریکل ... اسکیچ صفحہ ۱۰۰ وغیرہ

کے تحت میں آگئی ہو

میسور کی آزاد ریاست

ریاست حیدرآباد اور مرہٹوں پر انگریزوں کی بالادستی کے ضروری واقعات ہم آئندہ پڑھیں گے، یہاں جنوبی ہند کی ایک اور اسلامی قوت کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہے جو اسی زمانے میں ایک خود مختار و طاقتور حکومت بن گئی تھی اور گو اس کے قیام کا سلطنت مغلیہ کے زوال سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا لیکن وہ ہندوستان کے اسی عہد انقلاب کی سب سے دلچسپ تاریخی یادگار ہے:-

ابتدائی تاریخ اور مغلیہ سلطنت سے تعلق۔

جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نویس نے جتایا ہے "وہ تمام علاقہ جسے آجکل میسور کہتے ہیں حیدر علی سے پہلے کبھی کسی حکومت واحدہ کے زیر نگیں نہ ہوا تھا"۔ بلکہ جب سے اس کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے اسوقت سے اس علاقے میں دو تین ریاستیں قائم تھیں اور اس پورے علاقے پر سلطنت وجیانگر کا بھی قبضہ نہ تھا۔ پھر جب وجیانگر کی قوت میں زوال آیا اور چھوٹے چھوٹے پرگنوں کے زمیندار، جنھیں "پالی گار" یا "نائک" کہتے ہیں، خود مختار ہو گئے تو میسور یا سری رنگ پٹن (سرنگاپٹم) کے حاکم (یا "وڈیار") کی حیثیت بھی اس وقت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہ تھی اگرچہ اس کے قبضے میں دوسروں کی نسبت زیادہ علاقہ تھا ؛

یہ ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ میسور کے ان رئیسوں کا حکومت بیجاپور سے بھی کوئی مستقل سیاسی تعلق تھا یا نہیں لیکن جس وقت اورنگ زیب نے دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو سری رنگ پٹن کے وڈیار کی طرف سے وکیلوں نے حاضر دربار ہو کر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا اور اس کے جواب میں وہاں کے رئیس کو بادشاہ کی جانب سے "راجہ" کا خطاب ملا۔ بعد کی تاریخی شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے راجہ صوبہ دار دکن کے ماتحت اور سلطنت مغلیہ کے باج گزار سمجھے جاتے تھے اور نواب ناصر جنگ نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کے خلاف کرناٹک پر فوج کشی کی، تو اس موقع پر سری رنگ پٹن یا میسور کے راجہ نے بھی نواب نظام الملک کو بحیثیت باج گزار امدادی فوج بھیجی تھی۔[1]

صوبہ دار دکن کے ساتھ میسور کے ان ماتحتانہ تعلقات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ اسکے بغیر ہم نواب نظام الملک اور حیدر علی میں آیندہ مخالفت کے صحیح اسباب نہیں سمجھ سکتے اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ دربار حیدرآباد نے میسور کی اسلامی بادشاہی کا خاتمہ کرنے میں اسقدر سرگرمی کیوں دکھائی ؟

حیدر علی کا تسلط

القصہ یہ سری رنگ پٹن کا لائق راجہ (چِک دیو راج) جس نے اورنگ زیب سے حکومت کی

[1] ملاحظہ ہو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، مرلفۂ بوزنگ سابق کمشنر میسور، صفحات ۱۵، ۱۸، ۲۳ نیز دیکھو مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۸۵۰ وغیرہ وغیرہ۔

سند حاصل کی تھی، فوت ہوا (۱۱۹ھ/۱۷۰۴ء) تو اس کی اولاد میں کوئی راجہ ایسا نہ ہوا جو اولوالعزمی یا عمدہ اوصاف حکمرانی سے متصف ہوتا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی باگ رفتہ رفتہ اس کے وزیر جنگ یا "دلوائی" کے قبضے میں آگئی اور خاندانی راجہ محض "شاہ شطرنج" سمجھے جانے لگے، ادھر یہی زمانہ ہے جب کہ عام روایتوں کی بموجب حیدر علی کے قریشی النسل اجداد شمالی ہند سے ترک وطن کر کے دکن آئے اور بارہویں صدی ہجری کے وسط میں اُن کا خاندان بنگلور میں آبسا، حیدر علی کا باپ (فتح محمد) کرناٹک کی لڑائیوں میں مارا گیا تھا مگر اس نے اور اس کے بھائی اسمٰعیل نے میسور کے دلوائی کی فوجی ملازمت اختیار کی جس میں اپنی دلیری اور کارگزاری سے وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے؛ اور غالباً ۱۱۶۸ھ میں حیدر علی ضلع ڈنڈیگل کا فوجدار مقرر ہوا، یہاں اس نے پیادہ اور سوار فوج کی ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور فرانسیسیوں کی مدد سے گولے بارود کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا اور مجموعی طور پر اتنی قوت و شہرت حاصل کر لی کہ دو سال کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر یورش کی تو دلوائی نے حیدر علی ہی کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور محض اس کی مستعدی اور عمدہ سپہ سالاری کی بدولت حملہ آور تاوان جنگ لے کر ٹل گئے اور میسوری اضلاع ان کے ہاتھ میں پڑنے سے بچ گئے (۱۱۷۳ھ)۔

حیدر علی کا اس قدر اقتدار دیکھ کر میسور کے موروثی راجہ کو خیال آیا کہ اس کی مدد لے کر دلوائی کے پنجے سے رہائی حاصل کرے اور جب حیدر علی نے دلوائی کو نکال کر خود حکومت کا مالک بننا چاہا تو راجہ نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا۔ حیدر علی کو میسور سے بھاگنا پڑا اور مرہٹے واپس چلے گئے تو اس وقت بھی حیدر علی بہ مشکل اپنے رقیبوں کو زیر کر سکا لیکن تقریباً دو سال کی جد و جہد کے بعد آخر کار اسے کامیابی ہوئی اور ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء سے ہم اس کو ریاست میسور کا خود مختار حاکم کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے انہی دنوں نواب نظام الملک کے بھائی بسالت جنگ نے سیرا پر فوج کشی کی تھی۔ یہ مقام میسور کے شمال میں اورنگ زیب کے سب سے جنوبی صوبے کا مستقر تھا اور ان دنوں اس پر مرہٹے قابض تھے۔ بسالت جنگ کو اسے فتح کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن حیدر علی نے اسے تین لاکھ روپے دے کر سیرا کی صوبہ داری اپنے نام لکھوالی اور اسی سند میں اسے "نواب حیدر علیخاں" کا خطاب دے دیا گیا، مگر ظاہر ہے کہ یہ بسالت جنگ کی بے قاعدہ کارروائی تھی اور دربار دکن میں اس خطاب و سند کو کبھی نہیں مانا گیا چنانچہ حیدرآباد کی ہمعصر تاریخوں میں میسور کے نئے حاکم کو ہمیشہ "حیدر نائک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیدر علی کی فتوحات

بہرحال اب حیدر علی ریاست میسور کا خود مختار حاکم تھا موروثی راجہ کی حیثیت ایک شاہی

نظر بند سے زیادہ نہ تھی اور دوسرے رقیب بھی مغلوب ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اُس زمانے میں میسور یا سری رنگا پٹن کا علاقہ موجودہ ریاست میسور کی نسبت بہت کم تھا اور حیدر علی کی اولوالعزمی ایسی چھوٹی ریاست پر قناعت نہ کر سکتی تھی چنانچہ آئندہ بیس برس تک اس کی تمام زندگی جنگ و جدال میں گزری جس میں سے بعض لڑائیوں کی غرض کشورکشائی تھی اور باقی ان مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کے واسطے ہوتی رہیں، اس کی فتوحات کے تفصیلی حالات لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالی طور پر اس قدر لکھنا مناسب ہوگا کہ حیدر علی نے غالباً چتل درگ اور بدنور کی ابتدائی فتوحات کے بعد ہی جنوبی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ سوچکر اس کی تکمیل میں رفتہ رفتہ کورگ اور ساحل ملیبار کا تمام علاقہ فتح کر لیا تھا، مرہٹوں کی پیہم یورشش اور نواب نظام الملک اور انگریزوں کی شدید مخالفت کے باوجود شمال اور مشرق کی طرف بھی اس کی حدود سلطنت برابر بڑھ رہی تھیں اور ایک زمانے میں انگریزوں کو خود کرناٹک و مدراس کی سلامتی مخدوش نظر آنے لگی تھی ؂

ٹیپو سلطان

انگریزوں کے ساتھ ریاست میسور کی لڑائیوں کے حالات ہم آئندہ پڑھیں گے، جنگ کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ اس کے دوران میں حیدر علی نے وفات پائی (۱۱۹۵؁ھ / ۱۷۸۲؁ء) اور اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا "سلطان" کا لقب خود حیدر علی نے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے آخری زمانے میں بادشاہی کے تمام لوازم جمع ہو گئے تھے، اس کی خودمختاری ۱۱۷۷؁ھ سے مسلّم تھی، دکن کے صوبہ دار سے ماتحتی اور خراج گزاری کا تعلق بالکل منقطع ہو چکا تھا اور جنگی قوت و ریاست کے اضافے کے ساتھ حیدر علی کو اب نواب نظام الملک کی ہمسری کا دعوے تھا اور یہی وہ بات تھی جس نے حیدرآباد کی حکومت کو میسور کا سخت مخالف و رقیب بنا دیا ۱۱۹۲؁ھ میں اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کی نواب ساونور کی بیٹی سے شادی کی تو سری رنگا پٹن میں یہ رسم شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی، اسی طرح دیگر تقریبات یا درباروں کے موقع پر ہم حیدر علی کو بادشاہی لباس میں جلوہ گر پاتے ہیں اور فیل سفید پر اس کی سواری کا جلوس اسی ماہی مراتب اور ساز و سامان کے ساتھ نکلتا ہے جو خاص بادشاہوں کی شان تھی ؂

ٹیپو کے عہد میں قدرتی طور پر بادشاہی کی یہ شان زیادہ نمایاں ہوگئی ریاست میسور سرکاری طور پر "سرکار خداداد" کے نام سے موسوم ہوئی اور "حیدر نائک" کے فرزند نے "سلطان" کا پرشکوہ لقب اختیار کیا جسے دہلی کے برائے نام تاجداروں کے جیتے جی دکن کے طاقتور

صوبہ داروں نے بھی اپنے واسطے جائز نہ رکھا تھا، ایک اعتبار سے ٹیپو کی یہ خود نمائی کچھ بیجا بھی نہ تھی، رقبے میں تقریباً انگلستان کے مساوی ملک اس کے زیرنگیں تھا، نوے[1] ہزار جنگ آزما سپاہی اس کے حکم پر سر کٹوانے کے لیئے تیار تھے، روپے پیسے اور جنگی ساز و سامان کے ذخائر باپ کے ترکے سے ملے تھے اور اندرونی طور پر بھی اس کی ریاست خاصی منتظم حالت میں تھی لیکن "سلطان ٹیپو" کی یہی سطوت و قوت جس نے ٹیپو کو مغرور بنایا، اس کے ہمسایوں کی نظر میں کانٹے[2] کی طرح کھٹکتی تھی اور حیرت یہ ہے کہ ایسے خطرناک دشمنوں سے مقابلہ ہونے کے باوجود ٹیپو سلطان نے غالباً اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کیا کہ میسور کی نئی سلطنت کی بنیادیں نہایت ناپائیدار ہیں، بے شبہ حیدر علی نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی تھی اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھا کر بہت قوت بہم پہنچائی تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل ملک اسے دل میں محض غاصب سمجھتے تھے اور اس کے ہم قوم یا ہم مذہب لوگوں کی کوئی ایسی بڑی تعداد میسور میں آباد نہ تھی جو اس نئی حکومت کے استحکام کی ضامن ہوتی، ادھر ہمسائے میں تین بڑی طاقتیں موجود تھیں جنہیں کسی جو تھے رقیب کا خود مختار و قوی ہونا کسی طرح گوارا نہ تھا، اس حالت میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی بہترین حکمت عملی بظاہر یہی ہو سکتی تھی کہ جس طرح ممکن ہوتا ریاست حیدر آباد سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے اور کم سے کم رسمی طور پر میسور کی سابقہ باج گزاری کو نباہتے کہ ہمسائیوں کو حسد کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا، لیکن دولت و قوت حاصل کرنے کے بعد آدمی ایسی مصلحتوں کو باعث عار سمجھنے لگتا ہے اور ٹیپو سلطان کا تو یہ قول مشہور ہے کہ دو سو برس بھیڑ بن کر جینے سے کہیں بہتر ہے کہ میں صرف دو دن شیر کی طرح زندہ رہوں! چنانچہ گو ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء کی لڑائیوں میں اس کا نصف کے قریب ملک چھن گیا ("عہد نامہ سرنگاپٹم" ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء) اور وہ کبھی اپنے ملکی محصولات بڑھا بڑھا کے از سر نو بری اور بحری فوجیں فراہم کرنے کی کوشش اور کبھی فرانسیسیوں کے ساتھ سازباز کرتا تھا کہ اپنے تین تین دشمنوں کا کلہ بہ کلہ مقابلہ کر سکے لیکن خود ان دشمنوں کی باج گزاری یا اطاعت قبول کرنے کا اسے کبھی خیال نہ آیا اور آخر اسی جذبۂ خود مختاری کی خاطر اس نے جان دی (۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء) اسی کے ساتھ جنوبی ہند کی آزاد حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا ؛

۳ ۔ شمالی ہند کی ریاستیں

(۱) بنگالہ — بنگالہ سلطنت مغلیہ کا سب سے وسیع صوبہ تھا اور اس میں موجودہ بنگال اور بہار (و اڑیسہ)

---

[1] "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، صفحہ ۱۱۹

[2] "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، صفحہ ۲۲۳

کے تمام اضلاع شامل تھے لیکن صدر مقام ڈھاکہ تھا، صوبے کی زرعی خوش حالی اور بعض صنعتیں صدیوں سے مشہور تھیں اور گیارہویں صدی ہجری میں فرنگی تاجروں کی آمد و رفت کی بدولت اس کی بحری تجارت میں بھی نمایاں ترقی ہوگئی تھی، مگر اسے مرطوب آب وہوا اور وبائی امراض نے بدنام کر رکھا تھا مغل امرا اس دور دست علاقے میں آنے سے گھبراتے تھے اور مستعد کارگزار عہدہ داروں کی کمی سے اکثر یہاں کے مالی انتظامات میں ابتری رہتی تھی۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں اس کا عزیز اور لائق پوتا شہزادہ عظیم الشان بنگالے کا صوبہ دار تھا لیکن غالباً ماتحتوں کی حالت اس وقت بھی اصلاح طلب تھی کہ بادشاہ نے محمد ہادی نامی (ایک نومسلم برہمن) کو پہلے اڑیسہ اور پھر کل بنگالے کا دیوان بنا کر دکن سے ڈھاکے بھیجا اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے یہاں کی آمدنی بڑھا دی، نئے دیوان کی جزرسی نے جب شہزادہ عظیم الشان کے مصارف کو روکا تو شہزادہ دیوان سے بہت ناخوش ہوگیا بلکہ شہزادے کے اشارے سے ایک مرتبہ چند سپاہیوں نے دیوان پر حملہ بھی کیا لیکن وہ قابو میں نہ آیا اور جب بادشاہ کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے پوتے کو لکھ بھیجا کہ محمد ہادی بادشاہی نوکر ہے اگر سر موئے ضرر جانی یا مالی بہ او خواہد رسید انتقام آں از آں بابا خواہد کشید[۱]،،

یہی محمد ہادی ہے جو چند روز بعد مرشد قلی خاں اور پھر نواب جعفر خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار بنایا گیا اور ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۵ء تک اس عہدے پر سرفراز رہا، ڈھاکہ چھوڑ کر مرشد آباد کے مرکزی مقام کو اسی نے بنگالے کا مستقر بنایا اس کا پرانا نام مخصوص آباد یا مقصود آباد بدل کر، مرشد آباد کے نام سے اس کو نہایت رونق و ترقی دی، انتظامی قابلیت کے علاوہ اس کی سخت گیری اور انصاف پسندی ضرب المثل تھی اور کہتے ہیں کہ ایک مظلوم کے قصاص میں اس نے خود اپنے بیٹے کو جان سے مروا دیا تھا[۲]۔

جعفر خاں اپنے نواسے سرفراز خاں کو جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن خود سرفراز خاں کے باپ شجاع الدین والئی اڑیسہ نے یہ بات گوارا نہ کی۔ بیٹے نے بھی اس کے سامنے سر جھکا دیا اور دربار دہلی نے اسی (شجاع الدین) کو شجاع الدولہ اسد خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا۔ آئندہ تیرہ سال تک شجاع الدولہ نے حکومت کی اور جعفر خاں کی طرح وہ بھی نہایت منتظم اور لائق صوبہ دار

---

[۱] رقعات عالمگیری۔ نیز دیکھو ریاض السلاطین ۲۵۰
[۲] ریاض السلاطین صفحہ ۲۸۵

گزرا ہے جس کے سب فارسی اور انگریزی تاریخ نویس مداح ہیں ؎

علی وردی خاں

شجاع الدولہ اور نیز اس کا بیٹا سرفراز خاں حکومت دہلی کے فرمانبردار رہے اور گو بنگالے کے صوبہ داروں نے آیندہ بھی کبھی علانیہ خودمختاری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن صدر حکومت کی کمزوری سے سب سے پہلے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ پٹنے کا حاکم محمد علی وردی خاں تھا جسے خود شجاع الدولہ نے ادنیٰ مرتبے سے ترقی دیکر امرائے شاہی میں داخل کرایا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں نے پورے صوبے پر قبضہ کرلیا، (۱۱۵۳ ہجری)

یہ کارروائی حکومت دہلی کی بغیر اجازت و خلاف منشا عین اس وقت عمل میں آئی جب کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل تاجدار کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کردیا تھا، ادھر علی وردی خاں نے خراج کے نام سے تحفے تحائف اور کچھ روپیہ بھیجکر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا، اور آیندہ بھی اس رسم کو نباہتا رہا پس حکومت دہلی نے طوعاً و کرہاً اس کو بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کرلیا لیکن نہ تو علی وردی خاں کی یہ اطاعت سچی تھی اور نہ بادشاہ دہلی اسے کافی سمجھتا تھا چنانچہ بیس برس کے بعد شہزادۂ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کے ادھر آنے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ وہ بنگالے میں مغلوں کے قدیمی حقوق بادشاہی کو از سر نو قائم کرنا چاہتا تھا اور علی وردی خاں کے جانشینوں کو بنگالے کا حاکم جائز تسلیم نہیں کرتا تھا؎

شہزادۂ موصوف کی جدوجہد کا اجمالی حال ہم آیندہ پڑھیں گے یہاں خاص طور پر جتانے کے لائق یہ امر ہے کہ علی وردی خاں کی مذکورۂ بالا بغاوت و کامیابی نے بنگالے کے مقامی امرا اور عہدہ داروں میں سخت انتشار و ناراضی پیدا کردی اور مقتول صوبہ دار (یعنی سرفراز خاں) کے ہواخواہوں سے جب خود مقابلہ نہ ہوسکا تو انھوں نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا، اور ایک دو مرتبہ ناکامی کے بعد آخر میں مرہٹوں کی سالانہ یورش نے علی وردی خاں کو ایسا عاجز کیا کہ اُسے خاص بنگالہ بچانے کی خاطر اڑیسے کا صوبہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا اور بہت دن تک یہ علاقہ برار کے بھونسلہ حاکموں کے زیر نگیں رہا لیکن ان کی اس ؎ حکومت کی صورت صرف یہ تھی کہ چھٹے چھ ماہے مرہٹہ سوار اس طرف کا گشت لگاتے اور جس قدر ممکن ہوتا روپیہ جبراً رعایا سے وصول کرکے واپس چلے جاتے تھے ؎!

علی وردی خاں کی وفات کے بعد اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا

؎ گزے ٹیر جلد ہفتم صفحہ ۲۱۴

(سنہ ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء) لیکن اس کی حکومت کے پہلے ہی سال میں خانہ جنگیوں کے علاوہ انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی جس نے انجام کار ان مغربی تاجروں کو ملک بنگالہ کا مالک بنا دیا۔

(۲) اودھ

شمالی ہند کی ایک اور بڑی اور نیم آزاد ریاست خاص دوآب کے علاقے میں قائم ہوئی جسے سہولت کے لیئے "حکومتِ اودھ" کہتے ہیں، اس میں روہیل کھنڈ سے حدود بہار تک کے اقطاع داخل تھے اور ایک زمانے میں روہیل کھنڈ بھی فتح ہو کر شامل ہو گیا تھا اس ریاست کا بانی ایک ایرانی سوداگر برہان الملک سعادت خاں تھا جس نے اپنی سپاہیانہ قابلیت سے محمد شاہ کے عہد میں بڑی ناموری پائی اور الہ آباد و اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا لیکن اودھ کی جنگی قوت کو بڑھانے والا اس کا جانشین اور بھتیجا صفدر جنگ تھا جو آصف جاہ اول کے بعد سلطنت دہلی کا وزیر ہوا اور عرصے تک وہاں کی درباری سازشوں میں الجھا رہا، اس کی وفات اور اس کے بیٹے شجاع الدولہ کی جانشینی (سنہ ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء) کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، پانی پت کی تیسری جنگ کے وقت شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا لیکن آخر وقت تک مرہٹوں سے ساز باز کرتا رہا اور اس کی فوج نے لڑائی میں بھی کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اسی طرح اگرچہ شاہزادہ عالی گوہر (یا شاہِ عالم ثانی) کو بنگالے پر حملہ کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا لیکن درحقیقت اس حملے کا خاص محرک شجاع الدولہ کا چچیرا بھائی محمد قلی خاں ناظم الہ آباد ہوا اور شجاع الدولہ نے اُسے شہ دی تاکہ وہ اور شاہزادہ عالی گوہر اُس کی حدود سے باہر چلے جائیں، اور بنگالے کی لڑائیوں میں الجھے رہیں اور خود شجاع الدولہ کو ان کی کسی سازش و رقابت کا خوف نہ رہے

پھر تین چار سال کے بعد میر محمد قاسم والیٔ بنگالہ نے بہار سے بھاگ کر اس سے مدد مانگی، اور شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ ملکر دوبارہ بہار پر فوج کشی کی لیکن معاہدۂ اتحاد و دوستی کے باوجود شجاع الدولہ نے اپنے مہمان (میر قاسم) سے دغا کی اور اس کی فوج کے فتنہ پرداز فرانسیسی سردار سمرو یا شمرو کو ملا کر اپنا رفیق بنا لیا اور اس بے بسی میں میر قاسم کو ایک عرصے تک نظر بند رکھا، اس دغابازی سے شاید وہ بہار کے بعض اضلاع پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن اول تو انگریزوں نے اسے بکسر پر شکست دی (سنہ ۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء) دوسرے خود شاہ عالم اس کا ساتھ چھوڑ کر

سلہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۷۵۶ وغیرہ یہ حالات اور آیندہ میر قاسم والی بنگالہ کے ساتھ شجاع الدولہ کی دغابازی کا ذکر سیر المتاخرین کی دوسری جلد میں بہت تفصیل سے مرقوم ہے اور اس کتاب کا مولف ان واقعات کے وقت موجود اور اکثر معاملات میں خود شریک تھا۔

انگریزوں کے لشکر میں چلا آیا جنھوں نے اب خاص شجاع الدولہ کے ملک پر پیش قدمی کی اور والی بنگالہ سے فریب و حسد کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اسے بہت سا روپیہ انگریزوں کو دینا پڑا اور اضلاع کڑا مانکپور و الہ آباد و فتحپور شاہ عالم کے حوالے کرنے پڑے ؏

انگریزوں کا اثر

چند سال بعد جب شاہ عالم انگریزوں سے ناخوش ہو کر دہلی گیا تو الہ آباد کو پھر شجاع الدولہ کے سپرد کر گیا تھا، لیکن اب بادشاہ کے مرہٹہ رفیقوں کا زور ہوا اور انھوں نے شاہ عالم سے الہ آباد کی سند حاصل کر لی، اسی سلسلے میں انھوں نے روہیل کھنڈ پر حملہ کیا اور شجاع الدولہ کو اپنا ملک بچانے کی خاطر انگریزوں سے امداد لینی پڑی، اس فوجی امداد کے عوض میں اس نے انگریزوں کو پچیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا اور اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں مستقل طور پر انگریزی سفارت قائم ہو گئی جسے آئندہ انگریزی سیادت و حکومت کی تمہید سمجھنا چاہئے (۱۱۸۷ھ ۱۷۷۳ء) لیکن اس وقت البتہ شجاع الدولہ کو اس اتحاد سے یہ نفع پہنچا کہ اس نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ پر فوج کشی کی اور سوائے ریاست رامپور کے، یہ تمام علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ؏

سال آئندہ شجاع الدولہ نے وفات پائی (۱۱۸۸ھ) اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں انگریزوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ خود سعادت علی خاں کو جو شجاع الدولہ کے بعد سب سے لائق اور باخبر نواب اودھ مانا جاتا ہے، قریب قریب آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا (۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء) اور کہنا چاہیئے کہ اس وقت سے اودھ انگریزی حکومت کے بالکل تحت میں آ گیا[1] ؏

اودھ کی بعد کی تاریخ اہم سیاسی واقعات سے خالی ہے اور اس ملک پر براہ راست انگریزی قبضہ ہونے تک یہاں کے باقی نوابوں یا بادشاہوں کے حالات میں صرف اُن کی عیاشی کے عبرتناک قصے محفوظ رہ گئے ہیں، ان رنگ رلیوں کا مرکز لکھنؤ میں تھا جسے آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے اپنا پایۂ تخت بنا کے بڑی ترقی دی، ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سعادت علیخاں کے زمانے تک اودھ کے فرمانروا سلطنت دہلی کے قدیم خطاب "نواب وزیر" سے مخاطب کیئے جاتے تھے لیکن سعادت علیخاں کے جانشین غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۵ھ ۱۸۱۹ء میں انگریزوں کے مشورے سے "شاہ اودھ" کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا علٰحدہ سکہ جاری کیا اور یہ وہ جسارت تھی جس کا ٹیپو سلطان کے سوا ہندوستان کے کسی رئیس و راجہ نے

---

[1] ادکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۹۰۔ گورنر جنرل ولزلی کی یہ ایسی کھلی ہوئی زیادتی اور عہد شکنی تھی جس کا قریب قریب تمام انگریز مؤرخوں کو اعتراف کرنا پڑا ہو

اقدام نہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنی خودمختاری کے اعلان کو اب تک نام نہاد سلاطین مغلیہ کے لحاظ و ادب کے خلاف جانتے تھے ؎

(۳) پنجاب

یوں تو پائے تخت کے قریب ہی روہیلے اور جاٹ حکومت دہلی کے خلاف شورش و بغاوت کرتے رہتے تھے اور فرخ آباد، پیلی بھیت، رامپور، بھرتپور وغیرہ مقامات میں انکی کئی آزاد ریاستیں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس کتاب میں ہم صرف سکھوں کی آزاد ریاست کا ذکر کریں گے جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد پنجاب میں قائم ہوئی۔ قوم و نسل کے اعتبار سے یہ سکھ بھی اکثر جاٹ تھے مگر ایک خاص مذہبی فرقہ بن جانے کی وجہ سے انھیں اپنے دوسرے ہمقوموں اور عام ہندوؤں سے امتیاز حاصل ہو گیا اور بعد کے سیاسی اقتدار نے اس امتیاز کو اور بھی نمایاں کر دیا ؎

مذہبی طور پر سکھ مت کے لوگ اوّل اوّل مسلمان صوفیوں کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے اور بانی مذہب گرو نانک صاحب نے اپنی تعلیم میں وحدت وجود اور انسانی مساوات پر ہی سب سے زیادہ زور دیا ہے لیکن بعد میں جب ان کے دینی پیشواؤں نے ان کو علیحدہ سیاسی یا فوجی گروہ بنانا چاہا تو لازمی طور پر اُن کے عقائد و شعائر میں بھی ہندو مسلمانوں کے مذہب سے اختلافات پیدا ہوئے اور دسویں گرو گوبند سنگھ نے اِن اختلافات کو اور زیادہ واضح کر دیا حتیٰ کہ خود سکھ مت کے معتقد اس تجدید و اصلاح سے ناراض ہو گئے اور گرو گوبند سنگھ کو بہ مشکل اُن پر غلبہ حاصل ہوا ؎

انگریزی تاریخوں میں اس بات کو بہت شد و مد سے بیان کیا ہے کہ گرو گوبند سنگھ کی مذہبی اصلاح کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ سکھوں کو مسلمانوں (اور نیز برہمنوں) کا سخت دشمن بنا دیا جائے[۱] لیکن جب ہم پڑھتے ہیں کہ خود یہ گرو شاہ عالم بہادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمانوں کی طرف سے لڑنے دکن آئے، تو مذکورہ بالا اقوال کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھوں نے جب کبھی ست نامیوں[۲] کی طرح، مشرقی پنجاب کے کوہستانی اضلاع میں سر اٹھایا، تو ان کی سختی سے

---

[۱] مثلاً دیکھو سیل گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" فیز آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۲۴ وغیرہ۔

[۲] یہ ایک نیم مذہبی فرقہ تھا جس میں بالعموم ہندو جنیہ ور داخل ہو گئے تھے اور ان کی سب سے بڑی تعداد نارنول (ریاست پٹیالہ) کی نواح میں آباد تھی، یہیں کسی سپاہی سے کوتوالی کے کسی جوان کا جھگڑا ہوا اور اس نے بڑھتے بڑھتے بلوے بلکہ بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ شورش فرو کرنے کے لیئے شاہی فوجوں کو بھیجنا پڑا اور خاص باقاعدہ جنگ کے بعد یہ فساد رفع ہوا۔ یہ عہد عالمگیر کا واقعہ ہے اور اپنی پہلی تاریخ (برائے ہیٹ رک) میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں ؎

تنبیہ وتادیب کی گئی اور اس سلسلے میں شاہی افواج کے ساتھ ان کی کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں، آخر گرو گوبند سنگھ کا جانشین بندہ فرخ سیر کے عہد میں محصور ہو کر گرفتار ہوا اور دہلی میں سخت عقوبتوں کے ساتھ قتل کرا دیا گیا (۱۱۲۶ھ/۱۷۱۵-۱۶ء) تو اس وقت یہ شورش بھی فرو ہو گئی۔

سکھوں کی دوبارہ تنظیم

لیکن جس وقت احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور اندرونی جھگڑوں نے دربارِ دہلی کی فوجی قوت کو کمزور کر دیا تو سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا اور ان کے سرآوردہ زمینداروں نے جابجا اسی بارہویں صدی ہجری کے وسط میں وہ "مسلیں"، یعنی جتھے بنانے شروع کیے جو بعد میں خاصی قوی ریاستیں بن گئیں۔ ان مسلوں کی ابتدائی حیثیت قزاقانہ گروہوں کی سی تھی اور انکے اکثر گردونواح کا علاقہ لوٹتے پھرتے تھے، ان کا اس زمانے میں زیادہ زور سرہند و لاہور کی نواح میں تھا اور انہی شہروں کو لوٹنے کی سزا میں ایک مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے خاص سکھوں پر فوج کشی کی (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء) اور ستلج کے پار (برنالے کے قریب) انھیں سخت شکست دی اور بہت سا تاوانِ جنگ وصول کیا لیکن اس شکست نے سکھوں کو بہت فائدہ پہنچایا، عام قومی مصیبت میں وہ اپنے اندرونی جھگڑے بھول گئے اور دوبارہ انھوں نے ملکر سرہند پر چڑھائی کی اور شہر کو فتح کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی سال آئندہ بھی پنجاب آیا تھا لیکن سرہند کی طرف بڑھنے کی فرصت نہ ملی اور اس نے خود ہی سکھ سردار آلا سنگھ کو سالانہ پیشکش کے وعدے پر ضلع سرہند کی حکومت سونپ دی۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک بادشاہ کی جانب سے سکھوں کو ایک محدود ضلع کا حاکم تسلیم کیا گیا اور اس کے بعد سے انکی مسلیں مسلمان حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روز افزوں قوت حاصل کرنے لگیں، ان مسلوں کے مفصل حالات اس تاریخ میں لکھنے بے محل ہونگے، یہاں مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ ان کی بارہ مسلوں میں سے پانچ سب سے زیادہ طاقتور اور مشہور تھیں ا۔ پھولکیاں، اہلو والیہ، بھنگی، کھنیا، اور رام گڑھیا، آخر کی چاروں مسلوں کا علاقہ دریائے ستلج کے شمال میں تھا، اور پھولکیاں کے جتھے میں جو سکھ زمیندار شریک تھے ان کی اولاد آج بھی پٹیالہ، جیند، وغیرہ این روئے ستلج اس پار کی بڑی بڑی ریاستوں کی وارث ہے۔

رنجیت سنگھ

لیکن گوبرنالے کی جنگ کے بعد بارہویں صدی ہجری کے اخیر تک ان سکھ مسلوں کی قوت برابر بڑھتی رہی تاہم ان میں باہم کوئی سیاسی اتحاد نہ تھا اور ان کے سردار آئے دن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہی وہ کمی تھی جسے رنجیت سنگھ (ولادت ۱۱۹۴ھ) کی اولوالعزمی نے دور کیا اور اسلئے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا بانی مبانی اسی کو سمجھنا چاہیے اور اگرچہ یہ قوت کچھ زیادہ دیرپا نہ تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرتے ہی اسکا شیرازہ بکھر گیا تاہم سکھ ریاست کی یہ کمزوری بھی اسبات کا ثبوت ہے کہ خود

رنجیت سنگھ اپنی قوم میں نہایت غیر معمولی قابلیت کا سردار تھا؛
ابتدا میں رنجیت سنگھ اپنے باپ کے بعد سکھوں کی ایک چھوٹی مسل کا حاکم ہوا تھا جو اپنے مرکزی مقام کے نام پر سکر چکیا کہلاتی تھی، سکر چک کو رنجیت سنگھ کے بزرگوں نے امرتسر کے ضلع میں آباد کیا تھا لیکن اسی زمانے سے اُن کی قزاقانہ یورشوں کا حلقہ دریائے جہلم تک وسیع تھا اور یہی سبب ہوا کہ جب احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی بھاری توپیں پنجاب سے جاتے وقت دریائے جہلم کی ریتی میں دھنس گئیں تو اس نے رنجیت سنگھ سے وعدہ کیا کہ اگر انکو بہ احتیاط نکلوا کر کابل بھجدیا گیا تو اُسے راجہ کا لقب اور شہر لاہور کی حکومت عطا کر دی جائے گی (۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء) رنجیت سنگھ نے اس خدمت کو مستعدی سے انجام دیا اور سال آیندہ راجہ کے شاہی خطاب کے ساتھ لاہور میں داخل ہو کر باضابطہ اس شہر پر قابض ہو گیا؛
واضح رہے کہ لاہور پر کئی سال سے افغانیوں کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی ورنہ اس پر بھی سکھ سردار قابض تھے اور اس لیئے آیندہ چند سال تک رنجیت سنگھ کی انہی سکھ سرداروں سے لڑائیاں ہوتی رہیں جن کے آخر میں قریب قریب پنجاب خاص کے تمام علاقوں میں اس کی سیادت تسلیم کی جانے لگی اور ایں سوے ستلج کی سکھ ریاستوں کے معاملات میں بھی وہ مداخلت کرنے لگا، بلکہ کچھ روز کے واسطے انبالے پر قابض ہو گیا لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے تھے اور ہلکر سے لڑائیوں کے ضمن میں ستلج اِس پار کے سکھ سرداروں تک ان کا اثر پہنچ گیا تھا، معلوم ہوتا ہے ان سکھ سرداروں کو اپنے ہم قوم راجہ کا باج گزار بننا گوارا نہ تھا اور اس کی جنگی قوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا انھوں نے اپنی حفاظت کے عوض میں انگریزوں کی سیادت قبول کر لی اور انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے عہد لے لیا کہ وہ ستلج اِس پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا؛ (عہد نامہ امرتسر، ۱۸۰۹ء)

فتوحات ملتان و کشمیر وغیرہ

شمالی ہند کی سب سے بڑی قوت سے مصالحت کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ستلج کے شمال میں مزید فتوحات کی بخوبی فرصت مل گئی، اور اس نے چند ناکام حملوں کے بعد آخر کار شہر ملتان کو فتح کر لیا (۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء) جہاں کا حاکم مظفر خاں کئی سال تک حیرت انگیز شجاعت و مردانگی سے سکھوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور آخر میں بھی جب تک وہ زندہ رہا قلعۂ ملتان کو سکھ فتح نہ کر سکے؛
کشمیر کی فتح میں رنجیت سنگھ کو ملتان کی فتح سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے اور یہاں کے افغانی حاکموں نے کئی بار اُسے سخت شکستیں دیں، لیکن ۱۲۳۵ھ میں جب کہ کشمیر کا افغان حاکم دربار کابل

کے اندرونی جھگڑوں میں حصّہ لینے افغانستان چلا گیا تھا۔ سکھوں نے بعجلت اس ملک پر حملہ کیا اور اس مرتبہ ان کی کوئی خاص مزاحمت نہ ہوئی، اور یہ خوبصورت صوبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں داخل کر لیا گیا۔

رنجیت سنگھ کے آخری عہد کی لڑائیاں زیادہ تر پشاور و ڈیرہ جات کے علاقے میں ہوتی رہیں اور اگرچہ حکومتِ کابل کی اندرونی کمزوری اور سرحدی پٹھانوں کی باہمی نااتفاقی سے پشاور پر سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء ہی میں سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن یہ قبضہ جوکھوں سے خالی نہ تھا اور انھیں آیندہ بیس برس تک اس کے واسطے بہت سی قیمتی جانیں اور بے شمار روپیہ صرف کرنا پڑا اور کبھی حکومتِ کابل سے اور کبھی یہاں کے باشندوں سے مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں شاہ سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے مذہبی جہاد کی روح پھونک دی تھی۔

سکھوں کی سلطنتِ پنجاب پر انگریزی تسلّط کے حالات آیندہ ابواب میں ہماری نظر سے گزرینگے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ سلطنت دہلی اور کابل کی حکومتوں کی کمزوری کے زمانے میں رنجیت سنگھ کی ذاتی قابلیت و مستعدی سے قایم ہوئی تھی اور اس کی وفات (سنہ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء) کے ساتھ ہی اُس کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں کوئی ایسا لایق اور صاحب تدبیر سردار پیدا نہ ہوا جو اپنی جنگجو قوم کو پوری طرح قابو میں لا کر متحد رکھ سکتا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیمتی میراث کو اُس نئی قوت کے ہاتھ میں پڑنے سے بچا لیتا جو شمالی ہند میں سلاطین مغلیہ کی جانشین ہو گئی تھی۔

باب دوم

اہل یورپ کی آمد ہند میں

مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز

ہندوستان کی تاریخ میں دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی صدی میں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت قایم ہوئی اور شیر شاہی انتظامات اور اکبری فتوحات نے عرصۂ دراز کے بعد ممالک ہند کی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت شیرازہ بندی کی لیکن تمدن انسانی کی تاریخ میں اس سے بھی بڑھکر اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی صدی میں ہندوستان اور نیز "نئی دنیا" کے ساتھ اہل یورپ کی براہ راست بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا اور دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سنین سے پرتگال کے جہاز سواحل ہند تک آنے جانے لگے۔ اُس وقت تک دخانی جہاز ایجاد نہیں ہوے تھے اور اس لیئے اہل پرتگال و ہسپانیہ کی جہاز رانی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ایک طرف کلمبس بحر اوقیانوس کو طے کر کے امریکہ پہنچا اور دوسری طرف واسکو دگاما اپنے تین بادبانی جہازوں کو مغربی افریقہ کے گرد چکر دے کر ہندوستان کی جنوبی بندرگاہ کالی کٹ تک صحیح سلامت لے آیا۔ (۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۴ھ)

سواحل ہند کی بحری تجارت اُن دنوں اہل عرب کے ہاتھ میں تھی لیکن پرتگیزوں نے مختلف تدبیروں سے کالی کٹ کے راجہ سے تجارت کی اجازت حاصل کر لی، اس راجہ کو وہ اور دیگر اہل فرنگ "زموری" اور اہل عرب "سامری" کے لقب سے یاد کرتے تھے مگر یاد رکھنا چاہئیے کہ پرتگیز جہاز رانوں کی حیثیت تاجرانہ نہ تھی بلکہ ابتدا سے یہ جہاز راں شاہ پرتگال کے بحری عہدہ دار تھے اور اسی لیئے واسکو دگاما کی بخیریت واپسی پر اُس کے وطن میں سرکاری طور پر خوشی منائی گئی اور اسی زمانے سے اہل پرتگال ایشیا میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے کہ جس طرح امریکہ کے دریافت شدہ جزائر پر ہسپانیہ کا قبضہ ہو گیا تھا اسی طرح بحر ہند کے جزائر و ممالک میں پرتگال کا تسلط ہو جائے! چنانچہ دیڑھ دو سال کے بعد ہی ان کی حکومت نے تیرہ جہازوں کا

پرتگیزوں کے سیاسی منصوبے

بیڑا ہندوستان کی جانب روانہ کیا جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے، یہ بیڑا ہوا کی ناموافقت سے جنوبی امریکہ کی جانب بہ گیا اور وہاں سے بہت دن کے بعد کالی کٹ پہنچا، مگر پہنچتے ہی اُسکے سردار کی زمورن اور عرب سوداگروں سے لڑائی ہوگئی جس میں پرتگیزوں کے صدہا آدمی مارے گئے اور وہ کالی کٹ میں نہ ٹھیر سکے بلکہ ان کو مجبوراً کوچین کے راجہ سے امداد لینی پڑی جو کالی کٹ کے راجہ کا رقیب تھا ؛

اس مہم کی ناکامی کے بعد پھر واسکوڈیگاما بیس جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان آیا اور کوچین و کنانور کے رئیسوں کو ملا کر اس نے کالی کٹ پر باقاعدہ فوج کشی کی لیکن اس میں بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی اور پرتگیز اپنے کچھ سپاہی کوچین میں چھوڑ کر واپس چلے گئے، اسی زمانے میں شاہ پرتگال نے اپنے مذہبی پیشوا پاپائے روما سے ایک "فرمان" حاصل کیا جس میں اس مسیحی بادشاہ کو حبش، عرب، ایران، و ہندؔ کی تجارت، فتوحات اور جہازرانی کا "مختار" تسلیم کیا گیا اور ۱۵۰۵ء (۹۱۱ھ) میں اس نے ایک شخص المیڈا کو ہندوستان میں اپنا نائب یا "ویسرائے" بھی مقرر کردیا؛

اہل پرتگال کی یہ کاروائیاں اگرچہ مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ممالکِ ہند میں اپنی حکومت قایم کرنے کی فکر میں تھے اور اسی لیئے ان کی عرب تاجروں یا ہندی رئیسوں سے لڑائیاں ایک حد تک سیاسی تھیں جن کے ذکر میں پرتگیزوں نے حسب دستور بہت کچھ مبالغے سے کام لیا ہے، ان کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کئی سال تک جد و جہد کرنے کے باوجود پرتگیزوں کو ملک گیری کے منصوبوں میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور اُن کے مشہور بحری سردار البوکرک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مغربی ساحل ہند کے ایک جزیرے "گوآ (یا الیاس)" کو فتح کرلیا جو اُن دنوں سلطنت بیجاپور کے علاقے میں داخل تھا (سنہ ۱۵۱۰ء مطابق سنہ ۹۱۶ھ) پرتگیزی مصنفوں کا بیان ہے کہ اس فتح سے وہاں کے باشندے بہت خوش ہوئے تھے لیکن فتحمندوں نے جس بے دردی سے وہاں قتل عام اور غارت گری کا حکم دیا اس سے ان مصنفوں کے اقوال کی تکذیب ہوتی ہے[1]،

فتح گوا

[1] یہ حالات کم و بیش تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی تمام انگریزی تاریخوں میں درج ہیں لیکن ہمارا سب سے مستند ماخذ امپیریل گزیٹیر ہے (جلد دوم صفحات ۴۴۴ تا ۴۵۰ و جلد دوازدہم صفحات ۲۵۰ وغیرہ) نیز دیکھو آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۲۱ وغیرہ وغیرہ ؛

بہر حال گوآ پر اہل پرتگال کا قبضہ ہوگیا اور اس کو انھوں نے اس قدر مستحکم جنگی مقام بنا لیا کہ اپنے ہمسایۂ اہل ہند (خاص کر مرہٹوں سے)، اور نیز ولندیزوں سے بار بار لڑائیاں ہونے پر بھی یہ بندرگاہ اور اس کے مضافات میں کوئی تین ہزار مربع میل کا رقبہ آج تک اُن کے زیرنگیں ہے ؎

ہندوستان میں یہ مقام (گوآ) یورپ والوں کا پہلا مقبوضہ تھا جسے پرتگیزوں کی بحری تجارت اور جنگی قوت کی بدولت نہایت رونق حاصل ہوئی لیکن اس قوم کی سفاکی اور بداخلاقی ضرب المثل ہے اور لوگوں کو سخت ظلم و جبر سے عیسائی بنانا اس کی سیاسی حکمت عملی میں داخل تھا لہٰذا ایشیا میں پرتگیزی حکومت کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی اور ہندوستان میں جہاں کہیں مستقل اور بڑی حکومتیں قایم تھیں، وہاں پرتگیزوں کا اتنا زور نہ چل سکا کہ گوآ کی طرح دوسرے مقامات پر بھی متصرف ہو جاتے، گجرات کی بندرگاہ دیو یا دیپ کو انھوں نے سلطان گجرات سے مصالحانہ طریق پر حاصل کیا تھا (۱۵۳۵ء مطابق ۹۴۱ھ) لیکن تقریباً ایک صدی بعد بنگالے میں جب انھوں نے ہگلی کو قلعہ بند کر کے خود مختار حکومت کی شان بنانی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے نکال دیئے گئے اور اُن کے جو لوگ بچ کر بھاگ سکے اُنھوں نے بنگالے کے دشوار گزار ساحلی مقامات میں رہ کر بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا ؎

پرتگیزوں کا زوال

ان سب باتوں کے باوجود، پرتگیزوں کی آمد و رفت اور جنگی نو آبادیوں سے مجموعی طور پر ہندوستان کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچا اور انہی نے یورپ کی دوسری قوموں کو اس ملک کا راستہ دکھایا۔ خود اُن کا ملک ۱۵۸۰ء (مطابق ۹۸۸ھ) میں ہسپانیہ کی سلطنت کا جزو بن گیا تھا اور اس واقعے نے اُن کی بحری اور تجارتی ترقی کو اور بھی نقصان پہنچایا کہ یورپ کی وہ قومیں جو ہسپانیہ کی دشمن تھیں اب پرتگیزوں کو بھی ہر جگہ زک پہنچانے لگیں اور وہ اس امداد سے جو پہلے ان کی قومی حکومت دیا کرتی تھی، محروم ہو گئے، پھر گو نصف صدی کے بعد حکومت پرتگال ہسپانیہ سے علٰحدہ ہو گئی لیکن اس عرصے میں ولندیز اور انگریز تاجر ایشیائی سمندروں میں پہنچ گئے تھے اور ان قوی رقیبوں کے مقابلے میں پرتگیزوں کی تجارت و قوت کو پہلا سا فروغ پھر حاصل نہ ہو سکا بلکہ گیارہویں صدی ہجری (سترہویں عیسوی) کے وسطی سنین میں لنکا اور ملیبار پر ان کے جس قدر تجارتی مقبوضات تھے قریب قریب سب ولندیزوں نے چھین لیئے۔ اور ہندوستان میں اُن کی قوم کی آئندہ تاریخ "غرور اور افلاس و مصائب کی عبرت ناک داستان ہے کہ خشکی کی طرف سے تو دیسی ریئس اُن پر دباؤ ڈالتے تھے اور سمندر میں زیادہ طاقتور مغربی قومیں ان کی جگہ لیتی چلی جاتی تھیں" ؎

ولندیزی پانچ

مغربی قوموں میں سے سب سے پہلے ولندیزوں یا ہالینڈ والوں نے پرتگیزوں کا زور توڑا تھا۔ اوّل اوّل ان ولندیزوں کی ایشیائی تجارت نے پرتگیزوں ہی کی وساطت سے ترقی پائی اور اینٹ ورپ، ایمسٹرڈم وغیرہ شہر شمالی یورپ میں ایشیائی اجناس کی بہت بڑی منڈیاں بن گئے جہاں پرتگیزی جہاز ممالک ایشیا کا مال لاتے اور یورپ کی اشیاء مشرق کی طرف لے جاتے تھے۔ پھر وہاں کے لوگوں نے خود ان شرقی ممالک سے تجارت کرنی چاہی اور انگریزوں کی طرح اوّل اوّل اس کوشش میں رہے کہ یورپ و ایشیا کے شمال سے مشرق کا بحری راستہ دریافت کریں۔ اس میں اُن کو ناکامی ہوئی اور آخر انھوں نے بھی بحر ہند کا وہی (افریقہ کے گرد سے آنے کا) راستہ اختیار کیا جس سے اہل پرتگال ہندوستان پہنچے تھے۔ یورپ کی اس دوسری قوم کا پہلا ناخدا جو افریقہ کے گرد ہو کر واسکو ڈگاما سے ٹھیک ایک صدی کے بعد ایشیائی سمندروں تک پہنچا، ہاوٹ مین تھا۔ (۱۵۹۶ء مطابق ۱۰۰۴ھ)

اس کے بعد ولندیزوں یا ڈچوں کے اور تجارتی جہاز بھی آنے جانے لگے اور اُن کی پرتگیزوں سے کشمکش شروع ہوگئی لیکن اس موقع پر اُن کی اور اہل پرتگال کی آمد کا یہ فرق پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ولندیزوں کی اصلی غرض ایشیا آنے سے تجارت تھی اور اگرچہ یہ تجارت شروع ہونے کے دو تین سال بعد ہی اُن کے سب تاجروں نے مل کر تقریباً ½ ۵ لاکھ پونڈ کے سرمائے سے، ایک مشترکہ کمپنی (دی یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی آف دی نیدرلینڈز) قائم کی تھی جو اُن کی ملکی حکومت کی زیر نگرانی تھی تاہم پرتگیزوں کی طرح اس کمپنی کے جہاز یا ملازمین براہِ راست حکومت کے ملازم نہ تھے اور نہ پرتگیزوں کی طرح انھیں اوّل سے ممالک ایشیا کی فتح کا سودا تھا۔ کم سے کم وہ ایسے ملکوں پر ہاتھ ڈالنا نہ چاہتے تھے جہاں اہل ایشیا کی مستقل اور قوی حکومتیں موجود تھیں۔

بہر حال، ان کی آمد و رفت شروع ہونے پر بہت جلد اہل پرتگال سے تجارتی رقابت اور جنگ چھڑ گئی۔ جزیرۂ جاوا کے شہر بٹے ویا کے قبضے کو اہل پرتگال نے چنداں اہمیت نہیں دی لیکن جب ولندیزوں نے ۱۶۴۱ء (۱۰۵۱ھ) میں جزیرۂ ملاکا پر قبضہ کر لیا تو پرتگیزوں کی تجارت کو سخت صدمہ پہنچا اور ولندیزوں نے اُن جزائر ملایا (شرقی)[۱] کی طرف جہاں سے

---

[۱] ان جزیروں کو انگریزی میں عام طور پر (Spices Islands) یعنی "مسالے کے جزیرے" کہا جاتا ہے لیکن اس پورے مجمع الجزائر کا نام انڈونیشیا، یا جزائر ملایا ہے اور مذکورۂ بالا جزیرے اس کا شرقی حصّہ ہیں۔ لہٰذا ہم نے انہیں جزائر ملایا شرقی موسوم کیا ہے۔

گرم مصالحے یورپ جاتے تھے، اپنے رقیبوں کا آنا جانا دشوار کر دیا۔ پھر اُنھوں نے لنکا سے پرتگیزوں کو شکست دے کر نکال دیا اور تین سال کی مسلسل جنگ میں رفتہ رفتہ ساحل ملیبار کے تمام پرتگیزی مقبوضات چھین لیئے (سنہ ۱۶۶۳ء مطابق سنہ ۱۰۷۴ھ)۔ یہی زمانہ ہے جس میں ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیاں نہ صرف کورومنڈل اور بنگالے کے سواحل پر قائم ہوئیں بلکہ ڈھاکہ، پٹنہ، آگرہ، اور احمدآباد (گجرات) میں بھی اُن کے مستقل کارخانے بن گئے اور یورپ و ایشیا کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ اُن کی کمپنی ہوگئی۔

ولندیزوں کو اس زمانے میں تجارتی دولت اور بحری قوت نے یورپ والوں کا محسود بنا دیا تھا اور یورپ ہی میں انگریز اور فرانسیسی ہمسایوں سے اُن کی وہ جنگ چھڑی جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے سنہ ۱۷۱۳ء مطابق سنہ ۱۱۲۵ھ تک جاری رہی۔ اس کشمکش نے ولندیزوں کی قلیل التعداد قوم کو بہت مضمحل کر دیا اور جنگ کے آخری زمانے میں وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کے حلیف ہو جائیں۔ اس اتحاد کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ اُنھیں ایشیا کی تجارت میں انگریزوں کو حصے دار بنانا پڑا اور گو اُن کی بحری قوت نے فرانسیسیوں کی ہندوستانی تجارت کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن وہ خود بھی یہاں زیادہ فروغ و سرسبزی نہ حاصل کر سکے اور بارہویں صدی ہجری کے وسط میں ان کی تجارت و فتوحات کا مرکز جزائر شرق الہند کی طرف ہٹ گیا، جہاں اب تک کئی وسیع و زرخیز جزیروں پر اُن کا قبضہ ہے۔

دیگر فرنگی اقوام کی تجارت

ہندوستان میں ولندیزوں پر انگریزوں کے غلبہ پانے کا حال اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ اس جگہ مختصر طور پر یورپ کی دوسری اقوام کا حال بیان کرنا مقصود ہے جنھوں نے پرتگال اور ہالینڈ والوں کی دیکھا دیکھی ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں اہل ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ، جن کی گیارہویں صدی ہجری میں سیرامپور (بنگال) میں بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم تھی، جرمن اور آسٹریا والوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایشیا سے تجارت کے بہانے اپنی بحری قوت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ وسطی یورپ کے یہ ممالک اُن دنوں سیاسی طور پر آسٹریا کے بادشاہ کے ماتحت تھے اور وہ "شہنشاہ جرمانیہ" یا قیصر کہلاتا تھا۔ اور ہرچند اُس زمانے میں بحری تجارت اور جنگی جہازوں کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی جو آج کل حاصل ہے، پھر بھی دسویں صدی ہجری میں جہازرانی کے فروغ اور ہسپانیہ و پرتگال کے امریکہ اور ایشیا میں ملکی مقبوضات کا حال سُن سُن کر یورپ کی باقی تمام حکومتوں کو رشک

آتا تھا۔ اور وسطی یورپ کے بعض مدبرین اس خیال سے بھی خالی نہ تھے کہ محل وقوع کی وجہ سے بحری تجارت میں انھیں جو دشواریاں ہیں، ممکن ہو تو انھیں اپنی بحری قوت بڑھا کے دور کیا جائے۔ اسی قسم کی مصلحتیں تھیں کہ چند سال کے تامل و تذبذب کے بعد جرمن شہنشاہ شہر اوس ٹینڈ کے سوداگروں کا سرپرست بن گیا جنھوں نے بارھویں صدی ہجری (اٹھارویں عیسوی) کے اوائل میں ہندوستان سے تجارت شروع کی تھی۔ ملک بلجیم کی یہ بندرگاہ (اوس ٹینڈ) اُن دنوں جرمن شہنشاہ کے زیر سیادت تھی اور یہاں کی بحری تجارت کو ترقی دینے سے اسکا منشا یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس مقام کو سلطنت جرمانیہ کی بحری قوت کا ایسا مرکز بنا دے کہ ہالینڈ اور انگلستان پر اُس کا دباؤ رہے۔ تجارت میں بھی اول اول "اوس ٹینڈ کمپنی"، کو بہت نفع ہوا اور شہنشاہ سے باضابطہ سند تجارت ملنے کے چوتھے سال (سنہ ۲۶ء مطابق سنہ ۱۱۳۹ھ) اس کے حصے داروں میں ۳۳ فی صدی سے بھی زیادہ سالانہ منافع تقسیم کیا گیا۔ اس کمپنی نے کورومنڈل اور بنگالے میں ہگلی کے کنارے انگریزوں اور ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے اور انہی قوموں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ آخر شہنشاہ بعض مقامی فوائد کے عوض میں اس کمپنی کی سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور اُدھر ولندیز اور انگریز تاجروں نے ہگلی کے فوجدار (یا صاحب ضلع) کو مختلف حیلوں سے جرمن تاجروں کا دشمن بنا دیا اور اُس نے تھوڑی سی فوجی جمعیت بھیجکر انھیں جبراً اپنے علاقے سے خارج کر دیا اور اُن کی تجارتی کوٹھی جس کے گرد انھوں نے خندق اور جنگی برج تیار کئے تھے، چھین کر منہدم کرا دی[1] (سنہ ۱۷۳۱ء مطابق سنہ ۱۱۴۵ھ)

اسی سال سویڈن میں ایک تجارتی کمپنی بنی اور اوس ٹینڈ کمپنی کے بعض شرکا بھی اس میں حصہ دار ہو گئے۔ یہ کمپنی زیادہ تر چین و جاپان سے تجارت کرنی چاہتی تھی لیکن جرمن تاجروں کی شرکت کی وجہ سے رقیبوں نے پھر غل مچایا کہ یہ محض اوس ٹینڈ کمپنی کو ایک دوسرے نام سے جاری رکھنے کی کوشش ہے اور آخر تھوڑے ہی دن بعد اس کمپنی کا کاروبار بند کر دیا گیا۔

آخر میں پروشیہ کے مشہور بادشاہ فریڈرک (دی گریٹ) نے اپنی رعایا کو ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی "بنگال کمپنی" کے نام سے تاجروں کی ایک جماعت

---

[1] ریاض السلاطین میں فرنگی تاجروں کی باہمی رقابت اور اس لڑائی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ صفحہ ۲۷۔ نیز دیکھو گزٹیئر جلد دوم صفحہ ۴۶۵

مرتب کی (۱۶۳۵ء مطابق ۱۰۴۵ھ) لیکن اول تو اس کو ابتدا میں خسارہ رہا دوسرے کچھ حکومت بنگالہ کی مخالفت اور کچھ دوسرے فرنگیوں کی رقابت سے اہل پرتگال کو ہندوستان کے اس صوبے میں قدم جمانے کا موقع نہ مل سکا اور چند روز چوری چھپے تجارت جاری رکھنے کے بعد انکی یہ کمپنی ٹوٹ گئی ؀

۲- انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات

انگریزوں کی ابتدائی کوششیں

انگریز ملاحوں کو دسویں صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہندوستان پہنچنے کا شوق دامنگیر ہوگیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ فنِ جہاز رانی میں وہ پرتگیزوں کے محض مقلد نہیں بلکہ ابتدا سے ہمسری کے دعویدار تھے۔ اور گو نئے ممالک تک جہاز لیجانے میں سب سے بڑی کامیابیاں پرتگال اور ہسپانیہ کو نصیب ہوئیں لیکن انگریز بھی برابر اس دھن میں لگے رہے اور شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچنے کی کوشش میں جزیرہ نیوفونڈلینڈ سب سے پہلے انہی کے ملاحوں نے دریافت کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کے وسط میں اُن کے ایک بحری سردار نے یورپ و ایشیا کے شمال (یعنی بحر منجمد شمالی) کے راستے ممالک ایشیا تک پہنچنے کی کوشش کی اور خود اس سردار کے ہلاک ہونیکے باوجود اسکے بعض رفیق شمالی روس کے ساحل (بحر سفید) تک پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ شاہ روس کے پائے تخت ماسکو آئے اور ممالک روس کے راستے ایران و بخارا سے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اسیطرح اور کئی مرتبہ انگریز جہاز ران انہی شمالی راستوں سے ایشیا پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور انگلستان کے جو چار سوداگر سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ بھی بری راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے (۱۵۸۳ و ۸۴ء مطابق ۹۹۱ و ۹۲ھ) گوآ کے پرتگیزوں نے انھیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا لیکن آخرکار انھیں رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات برداشت کرنے کے بعد واپس اپنے وطن پہنچ گیا ؀

بحری تجارت کا آغاز۔

لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز اس وقت ہوا جبکہ ہسپانیہ اور پرتگال کی بحری قوت کمزور ہوگئی اور ہسپانیہ کے زبردست بیڑے (آرمیڈا) کی تباہی کے بعد انگریز سوداگروں نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ممالک ایشیا سے بحری تجارت کرنے کی اجازت دی جائے (۱۵۹۱ء مطابق ۹۹۹ھ) یہ درخواست منظور ہوئی اور اُن سوداگروں نے تین تجارتی جہاز ہندوستان روانہ کئے جن میں سے ایک راستے میں ڈوب گیا

دو جنوبی ہند تک آئے اور یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو افریقہ کے گرد پرتگیزوں کے دریافت کردہ راستے سے ایشیا پہنچے۔

آئندہ چند سال کی کوشش میں انگریزوں کو ہندوستان کی بحری تجارت میں چنداں نفع نہیں ہوا با ایں ہمہ انکے شوق میں اضافہ ہوتا رہا اور آخر میں لندن کے کئی دولتمند سوداگروں نے تقریباً، لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کمپنی مرتب کی اور سولھویں صدی عیسوی کے آخری دن ملکہ الزبیتھ نے بھی شاہی فرمان کی رو سے انکو ایشیا سے تجارت کی اجازت دے دی (۳۱ دسمبر سنہ ۱۶۰۰ء مطابق رجب سنہ ۱۰۰۹ھ) لیکن اول اول یہ کمپنی زیادہ تر جزائر شرق الہند سے بیوپار کرتی رہی اور جب اس کے جہازیوں نے پرتگال والوں کی دیکھا دیکھی ویسی سوداگروں کے جہاز لوٹنے شروع کیے تو ان جزیروں میں اسکی ساکھ بگڑ گئی اور تجارت میں نقصان ہوا۔[1]

پرتگیزوں اور ولندیزیوں کی رقابت

اس عرصے میں پرتگیزوں سے انگریزی کمپنی کی لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ان تجارتی رقیبوں کے خلاف ایرانیوں کو ملا لیا اور پرتگیزوں کی مقبوضہ بندرگاہ ہرمز (ارمز) سے انہیں خارج کر دیا (سنہ ۱۶۲۲ء مطابق سنہ ۱۰۳۱ھ) لیکن سواحل ہند پر اہل پرتگال نے بہت دن تک انگریزوں کے قدم نہ جمنے دیئے اور درحقیقت یہ حکومت پرتگال کی اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ وہ کرومول کے زمانے میں انگریزوں کی تجارت کا حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئی (۱۶۵۴ء مطابق سنہ ۱۰۶۵ھ)۔

دراصل انگریزوں نے جب ایشیائی سمندروں میں اپنے جہاز ڈالے اسوقت پرتگال کی بحری قوت میں زوال آرہا تھا اور ہالینڈ والوں نے انہیں شکستیں دیکر اکثر ایشیائی مقامات سے نکال دیا تھا۔ لہٰذا انگریزوں کو پرتگیزوں سے لڑ بھڑ کر اپنے واسطے جگہ نکال لینے میں اتنی دشواری نہ ہوئی جتنی کہ ولندیزوں اور بعد میں فرانسیسیوں کی مخاصمت کی بدولت پیش آئی۔ ہالینڈ کی بحری قوت کا اُن دنوں عروج تھا اور (سنہ ۱۶۰۹ء مطابق سنہ ۱۰۱۸ھ) میں ہسپانیہ سے صلح ہونیکے بعد اُسے اپنے دوسرے تجارتی رقیبوں سے لڑنے کی فرصت بھی مل گئی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ ولندیزوں کے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ یہ دونوں قومیں اسی زمانے میں رومن کیتھولک مذہب چھوڑ کر پاپائے رومہ کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھیں لیکن تجارتی اغراض نے بہت جلد اُن کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور سرکاری طور پر اعلان جنگ نہ ہونے کی حالت

[1] گرے ٹیئر، جلد دوم صفحہ ۴۵۵

میں بھی ان کے تاجروں کے جہاز ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ولندیزوں کی ابتدا میں کوشش یہ رہی کہ انگریز جزائر شرق الہند میں قدم جمانے نہ پائیں چنانچہ اُن کی جو تجارتی کوٹھیاں اُن جزیروں میں قائم تھیں اُن پر بارہا ولندیزی تاجروں نے حملے کیے اور جابجا انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔ ۱۶۱۹ء (مطابق ۱۰۲۸ھ) میں دونوں قوموں کے تاجروں کی یورپ میں مصالحت بھی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شریک رہ کر تجارت کریں لیکن اس عہد و پیمان کا ایشیا میں کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوا اور تھوڑے ہی دن بعد مذکورہ جزائر کے دو مشہور انگریزی کارخانوں پر ولندیز جبراً قابض ہوگئے۔

ایمبوئے نا کا قتل — ولندیزوں کی اس دشمنی کا سب سے مشہور واقعہ "ایمبوئے نا" کا قتل تھا یہ مقام جزائر ملایا میں واقع ہے اور یہاں ولندیزوں نے چند انگریز جہازیوں کو گرفتار کرکے اُن پر سازش و بغاوت کا الزام لگایا اور معمولی تحقیقات کے بعد سزائے قتل کا فیصلہ صادر کیا۔ تو انگریزوں کے ساتھ چند جاپانی اور ایک پرتگیز ملاح بھی شریک جرم قرار دیئے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ ولندیزوں نے ان سب کو خوفناک اذیتیں دیں اور آخر میں قتل کرا دیا (۱۶۲۳ء مطابق ۱۰۳۲ھ) انگلستان میں اس واقعے کی اطلاع نے سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا لیکن سالہا سال تک صرف خط و کتابت ہوتی رہی آخر کرامویل کے زمانے میں ہالینڈ کی حکومت نے ان مقتولوں کا خون بہا دلوا قبول کیا۔

دربار مغلیہ میں سفارتیں — غرض بیس بائیس برس کی جد و جہد کے باوجود جزائر شرق الہند و ملایا میں تو انگریزی تجارت کوئی فروغ نہ پا سکی البتہ اس اثنا میں کپتان ہاکنس اور سر ٹامس رو کی سعی و سفارت سے انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے علاقوں میں تجارت کرنیکی اجازت مل گئی یا کم سے کم انھیں یہاں کے حکام سے روشناسی حاصل ہوئی اور سورت میں انکی تجارتی کوٹھی بھی قائم ہوگئی۔ ہاکنس جیمس اول شاہ انگلستان کا خط اور بہت سے تحائف لیکر عہد جہانگیری کے آغاز میں آگرے پہنچا تھا (۱۶۰۸ء ۱۰۱۷ھ) اور دو تین سال تک حاضر دربار رہا۔ اُس کا بیان ہے کہ بادشاہ اُسکے ساتھ بہت عنایت سے پیش آیا اور ترکی زبان میں بغیر ترجمان کے گفتگو کی: نیز خلوت کے جلسوں میں بھی اُسے باریابی کا شرف بخشا اور چار صدی منصب عطا فرمایا[۱]۔ اسیطرح ٹامس رو جو تین سال بعد آیا بیان کرتا ہے کہ دربار مغلیہ میں اس کا بہت اعزاز و اکرام ہوا اور جہاں پناہ اسے اپنی بے تکلفی اور خلوت کے جلسوں میں شریک کرتے تھے لیکن وہاں ان انگریز سفیروں کے اقوال

[۱] ہاکنس ہس صفحہ ۹، ۳ وغیرہ وغیرہ

کی صحت میں شبہ ہے۔ اس بات کا تو وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ جن تجارتی اغراض کیلئے وہ دربار میں آئے تھے، اُن میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاکنس کو اگر واقعی منصب چار صدی عنایت ہوا تھا تو وہ دربار کے سب سے کمتر امیروں کا منصب ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اُس عہد کی سرکاری تاریخوں میں اُن سفیروں کا کہیں نام تک نہیں آتا اور جیسا کہ ہم ایک حاشیے میں بیان کر چکے ہیں۔ فارسی تواریخ میں صرف بالواسطہ شہادتوں سے تامس رو اور اُسکے انگریزی تحائف کے دربار میں پیش ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ دیگر ممالک کے سفیروں کی آمد کے تفصیلی حالات محفوظ ہیں اور یوں بھی سلاطین مغلیہ کے ذاتی مشاغل کی ایسی جزئیات فارسی تاریخوں میں قلمبند کی گئی ہیں کہ اگر ہاکنس یا تامس رو پر انکی خاص توجہ ہوتی تو یہ خلاف قیاس ہے کہ اُن کے ذکر سے یہ تاریخیں خالی ہوتیں ؎

ابتدائی کارخانے

بہرحال ۱۶۱۲ء مطابق (۱۰۲۱ھ) میں پہلی انگریزی کوٹھی سورت میں کھولی گئی اور بعد میں اسکی شاخیں برہانپور، احمد آباد، اجمیر، و آگرہ میں قائم ہوئیں جو مغربی ہند میں اُس زمانے کے بڑے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ خود سورت غالباً اُس عہد میں ممالک ایشیا کی سب سے زیادہ آباد و بارونق بندرگاہ تھی اور جب یہاں پرتگیزوں کے علی الرغم انگریزی تجارت کی بنیاد پڑ گئی تو دوسرے مقامات پر بھی پرتگیز اپنے نووارد حریفوں کو فروغ پانے سے نہ روک سکے، اور کئی ناکامیوں کے بعد ۱۶۱۶ء (مطابق ۱۰۲۵ھ) میں کورومنڈل کے ساحل پر مچھلی پٹم اور پٹیہ پلی، میں انگریزی دکانیں کھل گئیں، لیکن اس طرف انکی تجارت کے فروغ بلکہ کہنا چاہئے کہ حکومت کے آغاز کی تاریخ وہ ہے جب کہ چینا پٹم کے راجہ نے موجودہ مدراس کی زمین معاوضے پر بطریق معافی ایک انگریز ایجنٹ کو دے دی (۱۶۳۹ء مطابق ۱۰۴۹ھ) اور تھوڑے دن بعد یہاں انکا قلعہ سینٹ جارج تعمیر ہوا (۱۶۴۰ء مطابق ۱۰۵۰ھ) ؎

واضح رہے کہ جنوبی ہند کے ان علاقوں میں اسوقت تک مغلوں کی عملداری نہ ہوئی تھی اور وجیانگر کے زوال نے یہاں کے مقامی رئیسوں کو خود مختار و آزاد بنا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ چینا پٹم کا چھوٹا سا راجہ انگریزوں کو مدراس میں جنگی استحکام بنانے سے نہ روک سکا ورنہ مغلوں کے ملک میں جو اُن کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں وہاں وہ اس قسم کے قلعے بنانے کی جرأت نہ کر سکے اور انکی حیثیت خالص تاجرانہ رہی ؎ اسی گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں بنگالے میں انکے کئی کارخانے جاری ہوئے اور انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ یہاں اُن کی تجارتی ترقی بہت

کچھ ڈاکٹر بائوٹن کے رسوخ و کوشش کا نتیجہ تھی جو بنگالے کے مغل صوبہ دار کی سرکار میں ملازم (جراح) تھا۔[1]

انگریزی سوداگروں کا باہمی تنازعہ

لندن کے ان تاجروں کو اپنی وطنی حکومت کی طرف سے ایشیائی تجارت کا اجارہ مل گیا تھا لیکن شاہ چارلس اوّل کے زمانے میں بعض اور سوداگروں نے بھی تجارت کی اجازت حاصل کرلی اور اب دونوں کمپنیوں میں رقابت بلکہ کبھی کبھی جنگ وجدال ہونے لگی، ادھر انگلستان میں سخت خانہ جنگی برپا ہوگئی اور بہت دن تک حکومت درہم برہم رہی، آخر شاہ چارلس دوم کے زمانے میں ان سوداگروں میں باہم اتحاد ہوگیا اور از سرنو ایک فرمانِ شاہی حاصل ہوا جس کی رو سے نہ صرف تجارت، بلکہ اپنے ایشیائی مقبوضات میں انھیں ضرب سکّہ اور حکومت کرنے کے حقوق بھی مل گئے۔ (۱۰۷۱ھ مطابق ۱۶۶۱ء)

کمپنی کا تجارتی فروغ۔

اسی سال چارلس نے جزیرہ بمبئی کمپنی کو کرائے پر دے دیا، اصل میں یہ جزیرہ پرتگیزوں کے قبضے میں تھا اور جب پرتگال کی شہزادی کی شاہ انگلستان سے شادی ہوئی تو یہ بھی اُسکے جہیز میں شاہِ انگلستان کو ملا تھا۔ اس جزیرے کی اُن دنوں جو حیثیت و وقعت تھی اُس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ لکھنا کافی ہے کہ اس کا سالانہ کرایہ صرف دس پونڈ قرار دیا گیا تھا لیکن اول تو اسی زمانے میں سورت پر مرہٹوں نے تاخت کی دوسرے آہستہ آہستہ جزیرۂ بمبئی کی آبادی بڑھی اور انگریزوں کی چند عمارتیں تیار ہوگئیں۔ لہٰذا ۱۰۸۷ھ (مطابق ۱۶۷۶ء) میں کمپنی نے اپنے صدر کارخانے کو سورت سے بمبئی میں منتقل کرلیا اور اس وقت سے انگریزی تجارت کے ساتھ ساتھ اس جزیرے کی رونق و آبادی میں برابر ترقی ہوتی رہی۔

ملک گیری کے منصوبے اور ناکامیاں

یہی، بارہویں صدی ہجری کے آخری سنین کا زمانہ ہے جس میں انگریز سوداگروں کے دل میں شوق ملک گیری پیدا ہوا اور انھوں نے سرتامس رو کے سابقہ اصول عمل کو چھوڑ کر قرار دیا کہ آئندہ سے جہاں تک ممکن ہو کمپنی کے ملازمین اپنے تجارتی کارخانوں کو جنگی اغراض کے لئے مستحکم کریں اور فوجی مصارف اور منافع کے واسطے گرد و نواح کے علاقوں پر بھی تصرف حاصل کریں۔ کمپنی کی طرف سے اس نئے منصوبے پر عمل کرنے کے واسطے جو ہدایات تحریر کی گئی تھیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک گیری کا یہ جذبہ ولندیزوں کی تقلید اور مزید منافع حاصل کرنے کے لالچ سے پیدا ہوا تھا۔[2] مگر جب اس پر عمل شروع ہوا تو کمپنی

[1] گزیٹیئر جلد دوم صفحہ ۴۵۰
[2] کارکنان کمپنی کی نئی تجاویز کے الفاظ یہ تھے کہ "آئندہ سے ہمیں نہ صرف تجارتی نفع، بلکہ مالگزاری کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ

اور ہندوستان میں اس کے ملازموں کو سخت ناکامی و مصیبت اُٹھانی پڑی کیونکہ یہ ملک جزائر شرق الہند کی طرح جس میں ولندیزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا نیم متمدن مقامی رئیسوں میں بٹے ہوئے نہ تھے بلکہ مغلوں کی پُرشوکت و منظم مرکزی حکومت کے ماتحت تھے ؛

الغرض انگریزوں کی سرکشی کی خبر ہوتے ہی تمام صوبہ داروں کے نام شاہی احکام پہنچ گئے کہ ہر جگہ انکی دکانیں بند اور مال ضبط کر لیا جائے۔ اسی ضمن میں کمپنی کے بعض انگریز ملازمین قید کر لئے گئے اور بعض نے روپوش ہو کر جان بچائی ۔ کمپنی اپنے زعم میں سلطنت مغلیہ سے برسرِ پیکار تھی۔ لیکن یہاں اس کی طفلانہ "جنگ" کے حالات بیان کرنا تاریخ ہند کے ایک خفیف معاملے کو غیر معمولی اہمیت دینا ہوگا مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ گو کمپنی نے دو تین مرتبہ جنگی بیڑے روانہ کیے جن میں انگلستان کی شاہی فوج بھی تھی لیکن ان "حملہ آوروں" کی مجموعی تعداد غالباً دو ہزار سے کبھی زیادہ نہ تھی۔ اور انھوں نے سواحلِ بنگال پر جو حملے کئے ان سب میں نقصان و ناکامی ہوئی۔ پھر انھوں نے بحرِ عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کیے لیکن شاہی جہازوں نے اس دست برد کا بھی خاطر خواہ انسداد کر دیا اور دو تین سال کی اس "لڑائی" میں اہل ہند کا تو کوئی قابل ذکر ملکی یا مالی نقصان ہوا نہیں البتہ کمپنی کا دِوالا نکلنے کی نوبت پہنچی۔ آخر اس کے وکیلوں نے عجز و ندامت کے ساتھ بادشاہ سے معافی مانگی تب اُسے از سرِ نو کڑی و شوار تر شرائط پر تجارت کی اجازت حاصل ہوئی (سنہ ۱۱۰۲ھ مطابق سنہ ۱۶۹۰ء) نیز اسی سال انھیں کلکتے کے مقام پر زمین لے کر تجارتی کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی ؛ بایں ہمہ کمپنی کی اسی ایک جنگ نے اُس کو ایسا نقصان پہنچایا ، اور سبق دیا تھا کہ پھر نصف صدی تک انگریزوں کو "ملک گیری" کا حوصلہ نہ ہوا اور بعد میں بھی یہ صرف فرانسیسیوں سے تجارتی رقابت و آویزش کا نتیجہ تھا کہ وہ دوبارہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے پر آمادہ ہوئے ؛

نئی کمپنی اور اس کا اتحاد

معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے مذکورہ بالا نقصانات اور ناکامیوں نے وطن میں بھی اُس کی ساکھ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۱) اگر تجارت میں خسارہ ہو تو بھی اپنی "سپاہ" کے مصارف ادا کر سکیں۔ . . . . . یہی وہ مصلحت ہے جس کی بناء پر دانشمند ولندیز اپنی عام ہدایات میں جنھیں ہم نے دیکھا ہے ، اگر ایک فقرہ اپنی تجارت کے متعلق لکھتے ہیں تو دس فقرے سیاسی اور جنگی معاملات اور اپنی مالگزاری بڑھانے کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔ . . . . . " گزٹیئر جلد دوم صفحہ (۴۶۰)

بگاڑ دی اور وہاں کا "آزاد خیال" (وہگ) فرقہ اس کے تجارتی اجارے کے خلاف ہو گیا۔ اس اجارے کے باوجود بعض سوداگر چوری چھپے گنج کی تجارت تو پہلے بھی کرتے تھے لیکن اب جو کمپنی والوں نے بعض عہدہ داروں کو دریا دلی سے رشوتیں دے کر پارلیمنٹ کے بے اطلاع ایک تازہ فرمانِ شاہی حاصل کر لیا تو پارلیمنٹ میں عام ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور دارالعوام نے ایک تجویز منظور کی جس کی رو سے انگلستان کے ہر شخص کو ایشیا سے تجارت کا حق مل گیا اور کمپنی کے مخصوص حقوق سوخت کر لئے گئے۔ (۱۶۹۳ء مطابق ۱۱۰۶ھ)

نئی انگلش کمپنی

پرانی کمپنی کے توڑ پر ایک نئی "انگلش کمپنی" قائم ہوئی جس میں بہت سے دولتمند اور ذی اثر لوگ حصہ دار تھے۔ اس کمپنی کے مقرر کردہ ملازمین کی پرانی کمپنی کے نوکروں سے ہندوستان میں بہت دن تک جنگ زرگری ہوتی رہی مگر نئی کمپنی کو انگلستان میں جو رسوخ و اثر حاصل ہو گیا تھا ہندوستان میں حاصل نہ ہو سکا اور آخر عرصۂ دراز کے بے لطف تنازعات اور طویل بحث مباحثے کے بعد حکومت انگلستان نے دونوں کمپنیوں کو متحد کر دیا (۱۷۰۰ء مطابق ۱۱۱۹ھ) اور یہی[1] ایشیا سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی متحدہ جماعت[1] تھی جس سے بعد میں اہل ہند کو نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی واسطہ پڑا۔

مذکورۂ بالا اندرونی نزاع دفع ہونے کے بعد ان انگریز تاجروں کو پہلے سے زیادہ سرمائے اور اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت ہند کو ترقی دینے کا موقع ملا لیکن اورنگ زیب کے عہد میں مغلوں سے لڑائی چھیڑ کر وہ ایسا نقصان اٹھا چکے تھے کہ اب اُن کے تمام سیاسی منصوبے اور ملکی فتوحات کی آرزوئیں دلوں سے محو ہو گئی تھیں اور آئندہ چالیس برس تک اُنھوں نے ہندوستان کے معاملات میں حصہ لینے کی جسارت نہ کی۔ گزیٹیر کے مختصر تبصرے میں کمپنی کی اِس چہل سالہ تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اب کمپنی نے اسی قدیم طرزِ عمل کو اختیار کر لیا تھا کہ چپ چاپ اپنے بیوپار سے کام رکھے لہٰذا اس کی تاریخ میں یہ زمانہ قابل ذکر واقعات سے خالی ہے"۔ ۱۷۱۵ء سے ۱۷۱۷ء مطابق ۱۱۳۰ھ تک ایک انگریز ایلچی سورمان دربار شاہی میں رہا اور اس نے سلطنت مغلیہ کی طرف سے کمپنی کے لیے بعض تجارتی ذخیرہ

---

[1] "United Company of Merchants of England, trading to the East"

نوآبادیاں بسانے کی مراعات حاصل کیں اور کمپنی کے ملازمین کو اپنی آنکھوں سے سلطنت کی اندرونی خرابی دیکھنے کا بھی موقع ملا لیکن اس عرصے میں خود کمپنی نے اپنے کام سے کام رکھا۔۔۔ بدامنی سے جو خرابیاں ملک میں رونما ہو رہی تھیں اُن کے سب سے بڑے اثرات بمبئی میں ظاہر ہوئے جہاں ایک طرف انگریا نامی بحری قزاق ساحلوں پر کمپنی کی تجارت میں خلل ڈال رہا تھا اور دوسری طرف مرہٹوں کی آمد آمد نے کمپنی کی سلامتی کو مخدوش کر دیا تھا لیکن بنگالے کا نیم آزاد نواب اپنے انگریز ہمسایوں کے ساتھ مصالحانہ برتاؤ کرتا رہا اور مدراس میں انگریزوں کو اطمینان تھا کہ جبتک نواب نظام الملک اور مرہٹوں میں فیصلہ نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ محفوظ ہیں بایں ہمہ سنہ ۴۲ء (مطابق سنہ ۱۷۴۲ء) کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کے تینوں مرکزی کارخانوں تک مرہٹوں کا دستِ تصرف دراز ہو رہا ہے۔۔۔ یعنی اس سال ادھر تو مرہٹوں کا کرناٹک پر حملہ ہوتا ہے اور اُدھر دو سال بعد انگریزوں کو کلکتے کی حفاظت کے لیئے بعجلت خندق کھودنی پڑتی ہے" (جلد دوم صفحہ ۲۶۳)

۳۔ انگریزوں کا غلبہ فرانسیسوں پر

پرتگیزوں کے زوال قوت کا حال اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اندرونی قومی خرابیوں کے علاوہ ولندیزوں کی دشمنی سے اُن کو سخت نقصان پہنچا لیکن خود ولندیز ہندوستان میں پرتگیزوں کی جگہ نہ لے سکے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انکی چھوٹی سی ریاست کی حریف و ہمسایہ پروشیہ فرانس اور انگلستان جیسی قوی ریاستیں تھیں دوسرے یہ کہ ایشیا میں اُنکی آمد و عروج کے وقت مغلوں کی زبردست سلطنت قائم تھی ہندوستان میں ملک گیری کا موقع نہ تھا اور چونکہ ولندیز اب کسی ملک پر مستقل قبضہ کیئے بغیر وہاں تجارت کرنی پسند نہ کرتے تھے لہذا انھیں ہندوستان کے بجائے اپنے مستقر جزائر شرق الہند و ملایا میں بنانے پڑے، جہاں اُن کی کشور کشائی کو روکنے والی کوئی بڑی مقامی ریاست نہ تھی۔ خام اجناس خاص کر مصالحوں کی ان جزائر میں افراط تھی جس کی بدولت ولندیزوں کو وہاں کی تجارت و زراعت میں نفع بھی خوب ہوا اور انھوں نے یہاں ایسی مضبوطی سے قدم جمائے کہ اس مجمع الجزائر کے کئی بڑے بڑے جزیرے اب تک یورپ کی اسی چھوٹی سی قوم کے قبضے میں ہیں؛

اوّل اوّل انگریزی سوداگروں نے بھی بحر ہند کے ان جزائر میں اپنا بیوپار پھیلانے کی سعی کی تھی لیکن ولندیزوں کی رقابت اور قوت نے اُن کا یہاں زیادہ دخل نہ ہونے دیا

اور ناچار انھوں نے سواحل ہند ہی پہ اپنے مرکزی کارخانے بنائے۔ بے شبہ ان انگریز تاجروں کو بھی ولندیزوں کی طرح ملک گیری کا سودا تھا اور جیسا کہ ہم ابھی بیان کر رہے تھے، انھوں نے گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان کے بعض مقامات پر آزادانہ قبضہ کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن جب اس کوشش میں نقصان ہوا تو انگریزی کمپنی نے اپنا طرز عمل بدل دیا اور دوبارہ صرف تجارت کو اپنا مقصود قرار دیا۔ یہ کمپنی اب اپنے سیاسی منصوبوں کو بالکل ترک کر چکی تھی مگر تقدیر نے انگریزوں کو ہندوستان کی بادشاہی کے لیئے منتخب کیا تھا لہٰذا ان کی تجارت کے فروغ کے ساتھ ہی ہندوستان سے اُن کا تعلق بھی قوی ہوتا گیا پھر اسی تجارت کی حفاظت کی خاطر نیز دیگر اسباب نے جب اُن کو اپنے فرانسیسی حریفوں سے آمادۂ پیکار کیا تو گویا وہ بلا قصد دوبارہ سیاسیات ہند کے میدان میں داخل ہوئے۔

فرانسیسیوں کی آمد ہند میں

جہاں تک جہاز رانی کا تعلق ہے۔ فرانسیسی ملّاح بہت پہلے (دسویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں ایشیائی سمندروں تک پہنچ گئے تھے اور یکے بعد دیگرے فرانس میں کئی کمپنیاں بھی بنیں جن کا مقصد ممالک ایشیا سے تجارت کرنا تھا لیکن اہل فرانس اُن دنوں سپہگری کے دلدادہ تھے تجارت سے انھیں چنداں مناسبت نہ تھی۔ ان کمپنیوں کو ملک میں کوئی قبولیت نہ حاصل ہوئی اور وہ تھوڑے دن بعد بند ہو گئیں لیکن گیارھویں صدی ہجری (سترہویں عیسوی) کے وسط میں خود حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور شاہ لوئی چہاردہم کے عہد اور اس کے وزیر کول بیر کی سرپرستی میں سوداگروں کی ایک جماعت مرتب ہوئی جس کا مقصود ممالک ہند سے تجارت کرنا تھا۔ (۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء) اس کمپنی کا پہلا تجارتی کارخانہ چار سال بعد سورت میں قائم ہوا اور اگلے سال مچھلی پٹم میں ایک شاخ کھل گئی۔ لیکن اسی زمانے میں فرانس کی ہالینڈ سے جنگ شروع ہوئی اور اس کی چنگاریوں سے ان قوموں کے ہندوستانی کارخانے بھی محفوظ نہ رہے۔ کم سے کم تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور میلاپور (مدراس) کے ولندیزی کارخانے پر جن فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا انھیں ولندیزوں نے شاہ گولکنڈہ کی مدد سے جبراً خارج کر دیا۔ (۱۰۸۴ھ مطابق ۱۶۷۴ء)

پانڈیچیری کی بنا۔

یہاں سے نکلکر یہ فرانسیسی کوئی سو میل جنوب میں ساحل کورومنڈل کے اس مقام پر اترے جو تھوڑے دن پہلے انھوں نے سلطنت بیجاپور کے صوبہ دار شیر خاں لودی سے خرید اتھا یہ قطعہ زمین بیجاپور کے صوبۂ جنجی میں اسی نام کی ندی کے کنارے تھا اور یہیں مارٹین فرانسیسی

نے شیر خاں کی اجازت وامداد سے وہ بستی بسائی جو "پھل چیری" کہلاتی تھی اور بعد میں "پان ڈی چیری" (پان دی شیری) کے نام سے مشہور ہوئی۔ شیر خاں صوبہ دار کی راست بازی اور شرافت کے فرانسیسی مورخ بہت مداح ہیں اور اُسی نے بعد میں اُن کے آباد کاروں کو قریب کی زمینیں بھی بطور جاگیر عطا کر دی تھیں۔ اس طرح ولندیزوں کی دشمنی کے باوجود، یہ چھوٹی سی فرانسیسی بستی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگی اور ۱۷۰۶ء (مطابق ۱۱۱۸ھ) میں جب اس کا لائق بانی فوت ہوا، تو وہ ایک بڑا تجارتی اور جنگی شہر بن گئی تھی۔[1]

جب جنوبی ہند میں دولتمند فرانسیسی تاجروں کا ایسا باموقع صدر مقام بن گیا تو لازمی طور پر ان اقطاع کے مقامی رئیسوں سے بھی ان کی شناسائی ہو گئی لیکن محمد شاہ کے عہد یعنی بارھویں صدی ہجری کے وسط تک اُن کا اہل ہند سے تعلق خالص تجارتی تھا اور دوسرے فرنگی سوداگروں کی طرح وہ بھی لین دین اور بیوپار کے سوا دیگر ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ مگر ۱۷۳۵ء (مطابق ۱۱۴۸ھ) میں جب دیوما (Dumas) اُن کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا تو اُن کا یہ طرزِ عمل بدل گیا اور سچ یہ ہے کہ خود ہندی رئیسوں کے باہمی نفاق اور خود غرضی نے فرانسیسیوں کو اُن کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع دیا ورنہ محتاط دیوما خود ان جھگڑوں اور جوکھوں میں پڑنا نہ چاہتا تھا کہ مبادا فرانسیسی سوداگروں کی شہرت کو بٹہ لگے اور اہل ہند کی بدگمانی اُن کو نقصان پہنچائے۔[2]

فرانسیسی مداخلت ملکی معاملات میں

بہر حال پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۷۳۹ء (مطابق ۱۱۵۱ھ) میں تنجور کی مسند نشینی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور اپنی مدد کے بدلے میں قبضہ کاری کال حاصل کیا جو کول رون ندی کے دہانے پر واقع ہے اور ان دنوں نہایت باموقع تجارتی بندرگاہ سمجھا جاتا تھا۔ تنجور ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی اور فرانسیسیوں کو اُس کے اندرونی تنازعہ میں شریک ہونے سے کچھ تکلیف برداشت

[1] فرانسیسیوں کے ان حالات کا خاص ماخذ مےلیسن کی کتاب "ہسٹری آف دی فرینچ ان انڈیا" ہے۔ دیکھو صفحات ۲۰ تا ۲۶۔

[2] بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ خود دیوما نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور گزشتہ ایڈیشن میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے لیکن یہ قول واقعات کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنیوالا ہے اور ہماری مذکورۂ بالا رائے تفصیلی واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مےلیسن کی رائے کے موافق ہے۔ (دیکھو ہسٹری اوف دی فرینچ۔ باب سوم)

کرنی نہ پڑی۔ اور اس کا توقع سے بڑھکر قیمتی معاوضہ حاصل ہوگیا۔ لیکن اسی ابتدا نے اُن کو آخر کرناٹک اور دکن کی سیاسی پیچیدگیوں میں پھنسایا اور آئندہ اُن کی جلدبازی اور بیجا ہوس ملک گیری خود اُن کے حق میں ناسازگار ثابت ہوئی ؎

در اصل جب تک دوراندیش **ڈیوما** فرانسیسیوں کا حاکم رہا، اسوقت تک اُنکی شہرت وقوت برابر بڑھتی رہی اور اُس نے مرہٹوں کی یورش کرناٹک کے زمانے میں یہاں کے مقامی رئیسوں کی اعانت کی تو بھی فرانسیسیوں کی حیثیت محض احسانمند ہمدرد کی سی تھی اور دوست علی رئیس کرناٹک کے اہل وعیال کو مصیبت کے وقت **پانڈی چیری** میں پناہ دینا بھی محض ان احسانات کا معاوضہ سمجھا جاسکتا ہے جو اس خاندان نے غریب الوطن فرانسیسی سوداگروں کے ساتھ کیئے تھے لیکن مرہٹہ حملہ آوروں کے مقابلے میں اس پناہ دہی نے اِدھر تو رئیس کرناٹک کے خاندان کو فرانسیسیوں کا ممنونِ احسان بنالیا اور اُدھر اُنکی جنگی قوت اور جرأت کا دکن میں ایسا شہرہ ہوگیا کہ خود نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل نے ڈیوما کو خلعت بھیجا اور کچھ روز بعد دربارِ دہلی سے بھی اُسے منصب اور نوابی کا خطاب ملا۔ یہ ۱۷۴۰ و ۱۷۴۱ء (مطابق ۱۱۵۲ھ) کے واقعات ہیں، اور چونکہ **ڈیوما** اسی زمانے میں اپنی ملازمت سے دستکش ہوگیا تھا۔ لہذا اُس کی حاصل کردہ عزت وقوت سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس کے مشہور جانشین **ڈوپلے** کو ملا جو پہلے چندر نگر کے فرانسیسی کارخانے کا منتظم تھا اور اب **پانڈی چیری** کا صدر عامل یا گورنر مقرر رہا ؎ (۱۷۴۲ء)

ڈوپلے ڈوپلے کی اکثر انگریز مورخوں نے سخت مذمت کی ہے کہ وہ ذاتی طور پر مکار و بداخلاق آدمی تھا لیکن حال میں جب سے اہل فرانس کے ساتھ انگریزوں کی قدیم رقابت اور دشمنی میں فرق آیا ہے اس مذمت میں بھی کمی آگئی ہے اور اب ڈوپلے کی سازش و جعل سازی کی تاویل شروع ہوگئی ہے۔ خود اہل فرانس اب ڈوپلے کو اپنے محسنینِ قوم کی فہرست میں داخل کرتے ہیں حالانکہ زندگی میں اُنھوں نے بڑی ذلت وخواری کے ساتھ اُسے معزول کیا تھا۔ اس تغیر رائے کی ایک خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آجکل یورپ میں قومی فوائد کیلئے مکر و فریب کو بھی جائز سمجھا جانے لگا ہے پس ڈوپلے نے اگر ہندوستان میں کوئی سازش یا جعلسازی کی تو صرف اتنا ثابت کردینا

۱؎ مے لیسن ہسٹری اوف دی فرنچ"

ان جرائم کو محاسن کی شکل میں بدل دیگا۔ کہ یہ کام اُس نے فرانس کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے کئے تھے![1] لیکن ذاتی اخلاق سے قطع نظر ہمیں یہاں خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ دوپلے کی ناکامی کا اصلی سبب یہ ہوا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کے کام کرنا چاہتا تھا اور جلد بازی سے جو اہل فرانس کی قومی خصائص میں داخل ہے۔ تمام ممالک دکن کو چند ہی سال میں دبا لینے کا آرزومند تھا حالانکہ اہل ہند کو اندرونی خرابیوں نے خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو۔ مگر اُسوقت یورپیالوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ اتنی وسیع مملکت کو آسانی سے ہضم کر جائیں۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

بہرحال، دوپلے کو ہندوستانی معاملات میں کوئی خاص دخل دینے کا ابھی موقع نہ ملا تھا کہ ۱۷۴۴ء (مطابق ۱۱۵۷ھ) میں فرانس و انگلستان کی جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان جیسی بھی خود انگریزوں نے پیش دستی کی یعنی پانڈی چیری پر بحری حملہ کیا۔ اُن کی اس جرأت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اُس وقت اہل فرانس کا کوئی جنگی بیڑا ایشیائی سمندروں میں موجود نہ تھا اور اہل انگلستان لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ایک بیڑا خاص اس واسطے اِدھر روانہ کر چکے تھے کہ فرانس کی ایشیائی تجارت اور نوآبادیوں کو غارت کر ڈالے۔

اہل فرانس کی غفلت سے انگریزوں کو پانڈی چیری کی فتح کا موقع تو بہت اچھا مل گیا تھا لیکن اب کرناٹک، بیجاپور و گولکنڈے کے نااہل بادشاہوں کے تحت میں نہ تھا اور نہ وہاں دوست علی کے زمانے جیسی سی بدعملی تھی بلکہ اُسی زمانے میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول نے ازسرنو اس علاقے کا انتظام درست کیا اور وہاں اپنے ایک سردار انورالدین خاں کو ناظم بنا دیا تھا جیسا کہ پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ انورالدینخاں نہایت مستعد اور لائق حاکم تھا اور جب اس موقع پر دوپلے نے اس کے حضور میں انگریزوں کی زیادتی کی فریاد کی تو اس نے مدراس حکم بھیجکر جبراً انگریزوں کو پانڈی چیری پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ اُس کے تھوڑے ہی دن بعد مڈغاسکر سے ایک فرانسیسی بیڑا ہندوستان آ پہنچا اور اب خود دُوپلے نے مدراس پر فوج کشی کی اور انورالدین خاں نے اس فوج کشی کی اجازت اس شرط پر دی کہ فرانسیسی اس شہر کو تسخیر کرنے کے بعد نواب موصوف کے حوالے کر دیں گے۔

---

[1] بےلیسن۔ ۹۹-۱۰۰

سنہ ۱۷۴۶ء (اواخر سنہ ۱۱۵۹ھ) میں فرانسیسیوں نے مدراس فتح کر لیا لیکن اس پر قابض ہونیکے بعد اُن کے سرداروں میں باہم نزاع ہو گئی اور اسی جھگڑے کی وجہ سے شہر کا نواب انورالدین خاں کے حوالے کرنا ملتوی رہا۔ اور نواب نے جو فوج اس امید پر مدراس روانہ کی تھی کہ حسب اقرار فرانسیسی اس شہر کو خالی کر دینگے، اس فوج پر فرانسیسیوں نے غالباً دھوکے[۵۱] سے حملہ کیا اور شکست دی، ساتھ ہی دُوپلے نے مدراس کو مستقل طور پر فرانسیسی مقبوضہ بنانیکا اعلان کر دیا۔

جنگ میلاپور کی مفروضہ اہمیت

مذکورۂ بالا "جنگ"، مدراس کے چند ہی میل جنوب میں موضع میلاپور کے قریب واقع ہوئی تھی، یوروپین راویوں کا بیان ہے کہ اس میں نواب کی فوج تقریباً دس ہزار تھی اور مقابلے میں پانڈیچیری اور مدراس کے فرانسیسی سپاہیوں کی تعداد کم و بیش دو ہزار بتائی گئی ہے جن میں سے اصلی اور پہلا حملہ کرنے والے ایک ہزار سے بھی کم تھے، بلکہ اس فتح میں تعریف کا اصلی حقدار اگر فرنگی سپاہیوں کو سمجھا جائے تو ان کی تعداد اور بھی کم یعنے دو سو تیس کے قریب تھی[۵۲]، انہی "بہادروں"، کے حملے کی دشمن تاب نہ لایا اور طرفۃ العین میں بے حواس ہو کر فرار ہو گیا، پس میلیسن صاحب دعوے کرتے ہیں کہ تاریخ ہندوستان کی جس قدر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اس میلاپور کے معرکے سے زیادہ کوئی بھی یادگار کے قابل نہیں! پھر وہ اور قریب قریب تمام انگریز تاریخ نویس یقین دلاتے ہیں کہ یہی ایک معرکہ اس بات کا قطعی اور پہلا ثبوت تھا کہ ایک مٹھی بھر قواعد داں اور بہادر فرنگی سپاہ کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے بڑے سے بڑے لشکر کی کچھ حقیقت نہیں ہے! لیکن، اس سے قطع نظر کہ ان "فرنگی افواج" میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد فرنگیوں کی نسبت ہمیشہ سہ گنی، چہار گنی رہی ہے، یہ فرنگی مورخ خودستائی کے جوش میں اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ میلاپور کی لڑائی کو پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نواب انورالدین خاں کے اسی بے قاعدہ لشکر نے فرانسیسیوں کو کدلور کے قریب شکست دی اور یہ قواعد داں بہادر اس طرح فرار ہوئے کہ دو گھنٹے تک انھوں نے کہیں ٹھیرنے کا نام نہیں لیا![۵۳] (یکم دسمبر سنہ ۱۷۴۶ء)، پھر جب ہم پڑھتے ہیں کہ دوپلے کو آخر میں نواب سے اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ مدراس کے جنگی مورچے منہدم

[۵۱] اس لڑائی کا ہماری کسی فارسی تاریخ میں ذکر نہیں اور فرانسیسیوں کے بیانات کا جو خلاصہ میلیسن صاحب نیز دیگر انگریز تاریخ نگاروں نے بیان کیا ہے اس کا طرز تاریخ کے بجائے خیالی داستانوں سے ملتا جلتا ہے مگر دوسرا ماخذ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں چار و ناچار قیاس و درایت کے زور سے انہی مبالغہ آمیز روایات میں سے اصلی واقعات کا سراغ لگانا پڑے گا۔

[۵۲] ہسٹری اوف دی فرینچ، صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۲

[۵۳] ہسٹری اوف دی فرینچ صفحہ ۱۹۴ تا ۲۰۲

کرا دیئے جائیں گے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انورالدین خاں کا اصلی مقصود پورا ہو گیا۔
اسی ضمن میں یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظم کرناٹک کی دس ہزار فوج کے مقابلے میں فرانسیسی سپاہ کی جو تعداد (دو ہزار) بتائی گئی ہے وہ کسی قدر مشتبہ ہے کیونکہ اگرچہ برس پہلے، پانڈی چیری میں ضرورت کے وقت پانچ ہزار قواعد داں ہندوستانی اور ایک ہزار سے زیادہ فرنگی سپاہی بھرتی ہو سکتے تھے[1] تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈوپلے کے زمانے میں انکی تعداد اتنی کم کیوں تھی۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ وہ اپنے محتاط پیش رو سے کہیں زیادہ پر جوش و خود نما تھا اور اس جنگ کے موقع پر روپیہ بھی زیادہ صرف کر سکتا تھا؟

دورِ جنگ

بہر حال انگریز اور فرانسیسیوں کی یہ لڑائی یورپ سے شروع ہوئی تھی اور وہیں ختم ہوئی، (عہد نامۂ اکس لاشاپیل، مرتبہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) لیکن دو برس بعد ان کے باہم جو جنگ ہندوستان میں چھڑی وہ محض مقامی تھی یعنی حکومت فرانس و انگلستان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ ابتداءً یہ صرف ان قوموں کے تاجروں کی جنگ تھی (۱۷۵۰ء تا ۱۷۵۴ء مطابق ۱۱۶۷ھ)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کی وفات کے بعد مرحوم کے ایک نواسے (ہدایت محی الدین خاں عرف مظفر جنگ) کو بھی مسندِ دکن کا دعویٰ تھا اسیطرح کرناٹک کی نظامت کا حسین دوست خاں عرف چندا صاحب مدعی بن گیا جو یہاں کے پہلے رئیس صفدر علی کا داماد تھا اور ان دونوں کی پشت پناہی ڈوپلے نے اپنے ذمے لی۔ لیکن فرانسیسیوں کو مظفر جنگ کی رفاقت میں علانیہ دکن پر فوج کشی کی ہمت نہ تھی اور یوں بھی کرناٹک زیادہ قریب تھا لہٰذا اوّل اوّل انھوں نے چندا صاحب کی اعانت پر اکتفا کی۔ تقدیر کی یاوری سے پہلی ہی لڑائی میں نواب انورالدین خاں مارا گیا (جنگ امبر ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۹ء) اور اہل سازش ملک پر قابض ہو گئے۔ لیکن اس بغاوت کا حال سن کر نواب ناصر جنگ نے جب ادھر رخ کیا تو اتحادیوں نے پانڈی چیری کی جانب فرار اختیار کیا اور نواب ناصر جنگ نے یہاں تک بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر فرانسیسیوں نے بہت مستحکم مورچے اور دمدمے بنا لیئے تھے لیکن فرانسیسی سپاہی نواب ناصر جنگ کے زبردست لشکر کی آمد آمد دیکھکر گھبرا گئے۔ معمولی زد و خورد ہی میں ان کی شجاعت اور قواعد دانی کی قلعی کھل گئی اور وہ راتوں رات

---

[1] مے لیسن، کتاب مذکور صفحہ ۸۵۔

اپنے مورچوں سے چھپ کر بھاگ گئے۔ یورپی راویوں کا قول ہے کہ مظفر جنگ کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ پانڈیچری میں چلکر پناہ لینے کی صلاح دی تھی لیکن اس نے خود انکار کر دیا، اور دوسرے دن ماموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا (۱۷۵۰ء مطابق ۱۱۶۳ھ)

نواب ناصر جنگ اور پھر مظفر جنگ کے قتل اور فرانسیسیوں کے دربار دکن میں رسوخ حاصل کرنے کے حالات گزشتہ باب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں، انگریزوں نے اب تک ان سازشوں اور لڑائیوں میں کوئی نمایاں حصّہ نہیں لیا تھا لیکن دربار دکن میں فرانسیسیوں کا روز افزوں رسوخ دیکھکر انھیں سخت وہم و حسد پیدا ہوا اور بقول صاحب ماثرالامرا" ہوائے داخلت در ملک پادشاہی بہم رسیدہ کہ آلو آلو رادیدہ رشک میگیرد" اور چونکہ دکن تک رسائی دشوار تھی، لہٰذا ان کی کوشش کرناٹک تک محدود رہی اور وہ **نواب محمد علی خاں** کے حلیف و مددگار بن گئے۔ یہ شخص نواب انورالدین خاں کا چھوٹا بیٹا اور بہ اعتبار وراثت نظامت کرناٹک کا حقدار تھا، مگر چندا صاحب نے اُسے اب شمالی کرناٹک سے دھکیل کر ترچناپلی میں محصور کر رکھا تھا (۱۷۵۱ء مطابق ۱۱۶۴ھ) اور ابتدا میں انگریز بھی اُس کو بچانے سے مایوس ہو گئے تھے لیکن اس مہم کو جلد سے جلد فیصلہ کرنے کی دھن میں چندا صاحب نے اپنی تمام فوج اسی شہر (ترچناپلی) کے گرد جمع کر لی تھی اور خود اپنے صدر مقام ارکاٹ کو غیر محفوظ چھوڑ آیا تھا، اتفاق سے انہی دنوں تازہ دم فوج انگلستان سے مدراس آئی اور چونکہ اسے ترچناپلی بے جانا دشوار و بیکار نظر آتا تھا لہٰذا کلائیو کو ارکاٹ پر حملہ کرنے کی تدبیر سوجھی اور انگریزوں نے یک بہ یک پہنچکر بلا مزاحمت اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔

محمد علی کی کامیابی

قرینہ کہتا ہے کہ چندا صاحب کو اس بات کا گمان نہ تھا کہ مدراس کے انگریز تاجر بطور خود اس کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت کریں گے لیکن اس واقعے نے لڑائی کا رنگ بدل دیا اور چندا صاحب کو ترچناپلی کے محاصرے کے ساتھ اپنا صدر مقام واپس لینے کی فکر لاحق ہو گئی۔ اسی وقت فرانسیسیوں کو بھی غالباً اپنی ہوس بیجا کے برے

سلسلہ ہے لیبن صفحہ ۲۹۴ و ۲۹۲ وغیرہ - مگر یہ روایتیں بناوٹ سے خالی نہیں - صاحب ماثرالامرا نے اسی واقعے کو مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "بست و ششم ربیع الآخر ۱۱۶۳ھ تا سہ پاس کامل آتش خانۂ فرنگ سرگرم اشتعال بود۔ آخر کار (در تاریخ) بست و ہفتم منہ فرنگیاں از رعب و مہابت محمدیاں رو بہ ہزیمت آوردند و ہدایت محی الدین خاں زندہ دست گیر شد"، جلد سوم صفحہ ۴۵۳

نتائج اور یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ اُن کا جنوبی ہند میں فروغ محض مکر و سازش کی اتفاقی کامیابی ہے ورنہ خود ان میں اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ حیدرآباد ایک طرف، صرف کرناٹک ہی کو اپنے قابو میں رکھ سکتے، کیونکہ محمد علی کی وجاہت و خوش نصیبی نے بہت سے ہندی رئیسوں کو اس کی اعانت پر آمادہ کر دیا اور آئندہ سال خود چندا صاحب گھر کر گرفتار و قتل ہوا تو فرانسیسی کچھ بھی نہ کر سکے اور کرناٹک میں نواب محمد علی کا کوئی حریف نہ رہا انگریزوں کو بھی محمد علی کے جیتے جی ملک میں مداخلت کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا، تاہم متعدد فوائد و مراعات کے علاوہ یہی جیت کچھ کم نہ تھی کہ فرانسیسیوں کا کرناٹک میں کوئی اثر نہ رہا، اور وہ آئندہ جنگ میں پانڈی چیری کی بھی خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے؛

فرانسیسیوں کی آخری جنگ اور شکست

یہ آخری جنگ انگلستان و فرانس کی مشہور "جنگ ہفت سالہ" کا ضمیمہ تھی جس کا یورپ میں ۱۷۵۶ء (۱۱۶۹ھ) میں آغاز ہوا، اور حکومتِ فرانس نے اپنے مشہور فوجی سردار کونٹ لالی کو خاص ہندوستان کی مہم پر مامور کیا کہ وہاں سے انگریزوں کو نکال دے لیکن لالی کسی قدر سخت گیر و خود پسند آدمی تھا دوپلے کئی سال پہلے "گورنری" سے معزول کر دیا گیا تھا اور ہندوستان میں لالی کو اپنے دوسرے عیش دوست اور نافرمان ہموطنوں سے کوئی مدد نہ مل سکی بلکہ بعض اوقات انھوں نے اُسے زک دینے کی کوشش میں اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک وقت یہ پیش آئی کہ ریاست حیدرآباد سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہوگئی تھیں اور ادھر حکومت فرانس ایک دفعہ لالی کو بھیجکر ہندوستان کی طرف سے ایسی بے خبر ہوگئی تھی کہ انگریزی بیڑا اور تازہ دم فوجیں ہندوستان آئیں، مدراس کا محاصرہ کرتے کرتے فرانسیسیوں کو خود محصور ہونا پڑا لیکن فرانس والے اپنے قلیل التعداد ہموطنوں کو کوئی مدد نہ پہنچا سکے، پھر پانڈی چیری میں محاصرین کی بری اور بحری ناکہ بندی نے سامان خوردنی کا قحط ڈال دیا تو مجبور ہو کر فرانسیسیوں نے شہر کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اطاعت قبول کر لی (جنوری ۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۴ھ)

یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے بعد جب صلح ہوئی تو فرانس کے قدیم ہندوستانی مقبوضات بھی اُسے واپس ملے (۱۷۶۳ء) انگریزوں نے پانڈی چیری کی عمارات کو بے دردی سے گرا کر

سلہ غالباً اس کا سب سے بڑا یہی قصور تھا جس کی بنا پر پروٹسٹنٹ اسمتھ صاحب نہایت بانازی پیرائے میں اس کی مذمت کرتے ہیں!! (دیکھو آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۴۷۶ وغیرہ)

شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی[51]۔ اب اگرچہ بروئے معاہدہ یہ مقام ان کو واپس دینا پڑا اور فرانسیسیوں نے دوبارہ اسے تعمیر کرالیا تاہم ان سے یہ شرط لے لی گئی کہ آئندہ یہاں کبھی جنگی استحکامات نہ بنائے جائیں گے، چنانچہ گو بعض مقامات پر اب تک اہل فرانس کی عملداری ہے لیکن جنوبی ہند میں اُن کے منصوبۂ ملک گیری کا اسی وقت سے خاتمہ ہوگیا، اور ان کے موجودہ مقبوضات محض تجارتی اور غیر مصافی حیثیت رکھتے ہیں۔

[51] اوکس ہس صفحہ ۰۸۴ بحوالہ اورم وغیرہ

باب سوم

ابتدائی مقبوضات اور لڑائیاں

۱ - دیوانیِ بنگالہ

ممالک ہند پر انگریزی تسلط کے جملہ واقعات نہایت شرح و بسط سے انگریزی زبان میں موجود ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک ایسی قوم کے لکھے ہوئے ہیں جو آخر کار اس وسیع ملک پر حکمراں ہوگئی - اس لیئے اپنی فضیلت اور دوسروں کی تحقیر سے اُس کی معمولی تاریخوں کا خالی نہ ہونا ایک قدرتی امر ہے، دنیا کا قاعدہ بھی یہی رہا ہے کہ ملک گیری کی تاریخ ملک پر تسلط کرنے والے لکھا کرتے ہیں تاکہ ان کا نام دنیا میں روشن ہو اور ان کی اولوالعزمی کی مثالیں اُن کی اولاد و اخلاف کے پیش نظر رہیں لیکن جن قوموں کے ملک پر تسلط کیا جاتا ہے وہ انقلاب حکومت کے زمانے میں یا تو بالکل خاموش رہتی ہیں یا اگر قلم اٹھاتی بھی ہیں تو زیر دست اور مغلوب کی حیثیت سے جس کا نتیجہ پڑھنے والے کے لیئے بجز انفعال کے اور کچھ نہیں ہوتا، بہر کیف قومی تفاخر اور تعلّی کے ساتھ تاریخ نویسی گو قوم بالادست کے لیئے کیسی ہی دلکش اور مفید ہو لیکن جو قومیں اُس وقت مغلوب ہیں اُن کے حق میں علاوہ غیر صحیح ہونے کے ایسی تاریخ موجب نقصان و دلشکنی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے افسوس ہے کہ اس تاریخ کے اکثر بیانات یک طرفہ یا غلط یا مشکوک سمجھے جاتے ہیں ؛

لیکن طالب علم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قطع نظر ایسے تاریخی سرمایہ کے جس کو ہم اطمینان سے اپنا کہہ سکیں خود انگریزی زبان میں انگریزی عہد حکومت کے حالات اور واقعات کا ذخیرہ اس قدر وافر ہے اور بعض انصاف پسند اور راست گو انگریزوں نے خود اکثر واقعات کے تمام پہلوؤں پر ایسی مفصّل بحث کی ہے کہ جہاں کہیں طالب علم کو کوئی شک یا شکایت پیدا ہو تو وہ ان کے مطالعے سے کوئی اطمینان بخش نتیجہ ایسا نکال سکتا ہے جس کو عام انگریزی تاریخوں نے نظر انداز کر دیا ہے اور دوسروں کی کہانی اپنی زبان سے اسی طرح سُنا سکتا ہے جیسے کہ اپنی کہانی دوسروں کی

زبان سے سنتا رہا ہے۔ بہرکیف طالب علم کا فرض ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی شکایت ہو نہایت تحقیق و تجسس سے انصاف کو مد نظر رکھکر تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرے اور صحیح نتائج تک پہنچکر جو کوفت غیروں سے اپنی خرابیاں سُن کر دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کو علمی وسعت اور عالی حوصلگی سے رفع کرے اور انسان کے تعلقات کو جو ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے اچھی اُمیدوں کے ساتھ بلند نظری سے دیکھے اور سمجھے کہ سچائی کبھی کسی کے چھپائے نہ چھپے گی!

حیدر علی حاکم میسور کے حالات میں ایک انصاف پسند انگریز لکھتا ہے کہ اس نامور شخص کی نسبت قابل اطمینان رائے قائم کرنی دشوار بلکہ محال ہوگئی ہے کیونکہ اس بارے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رائیں رقابت قومی کی وجہ سے بالکل متضاد ہیں"۔ اس قول سے ہی اس نتیجہ پر پہنچنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ جس وقت سے یورپ کی قوموں کا قدم ہندوستان میں آیا اس ملک کی صحیح تاریخ مختلف قیاسی روایات کے انبار میں دب گئی لیکن ایک ذہین متجسس کے لیئے اسی انبار سے صحیح واقعات کا آشکارا کر دینا دشوار سہی مگر غیر ممکن نہیں۔

زمانۂ انقلاب کی تاریخ کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ایک مشکل یہ ہے کہ خود ہند کے مصنفین عصر نے (تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک) عہد برطانوی کی کوئی مفصل و مستند تاریخ نہیں لکھی۔ سیر المتاخرین یا ریاض السلاطین وغیرہ مقامی تاریخیں ملتی ہیں لیکن یہ بھی ایک حد تک انگریزوں کی سرپرستی کی امید پر لکھی گئی تھیں اس لیئے اطمینان نہیں ہوتا کہ وہ رو رعایت سے خالی ہونگی۔ پھر بھی اُن کی شہادت معمولی انگریزی تاریخوں سے زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتی ہے ہم بھی جہاں تک ممکن ہوگا ان تاریخوں سے گو وہ ناکافی اور قلیل ہیں مدد لیں گے۔ مگر مجموعی طور پر انگریزی کے سرمایۂ معلومات پر حصر کیئے بغیر چارہ نہیں۔ اس کو بھی ہم کوئی بیچارگی محض تصور نہیں کرتے کیونکہ خود اس سرمائے میں ایسا مواد مل جاتا ہے جس سے عام انگریزی تاریخوں کی بے احتیاطی ظاہر ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس مختصر تاریخ میں ہم نے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں کہیں مشکوک یا غلط روایات کی تصحیح خود انگریزی اسناد سے یا اپنی کتابوں سے نہیں ہو سکی ہے وہاں از روئے درایت اُن کی صحت یا عدم صحت سے بحث کی ہے اور روایت کی غلطی یا اُس کا ضعف ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

بلیک ہول کا قصہ

اتفاق سے انگریزوں کے قبضۂ بنگالہ کی تاریخ کا پہلا ہی واقعہ ایک مشکوک اور مبالغہ آمیز

روایت کی مثال پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کی مشہور انگریزی تاریخیں جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان سب میں بلیک ہول کا قصہ طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کے پڑھنے سے گمان ہوتا ہے کہ ہسپانیہ کے اہلِ مسیحی نے مسلمانوں اور یہودیوں کو سخت اذیتیں دیکر جان سے مارنے کے جو طریقے نکالے تھے اُن سے سراج الدولہ کی غفلت اور بے پروائی کا یہ ہولناک واقعہ انسان کی ایذارسانی میں کچھ کم نہ تھا لیکن چند سال ہوئے کہ خود ایک انگریز مسٹر لٹل ساکن بنگالہ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے رسالہ "بنگال ماضی و حال" میں ایک مضمون لکھکر اس قصے کے بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات و مراسلات سند میں پیش کیئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدت تک اس قصے کی کسیکو خبر تک نہ تھی اور نظماء کمپنی کو انگلستان میں اس کی کبھی (سرکاری طور پر) اطلاع تک نہیں دی گئی۔ مزید براں بنگالہ کی دو ہم عصر فارسی تاریخیں موجود ہیں جن میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں سے ناراضی اور کلکتہ کی تسخیر و غارت گری کے حالات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے مگر ان میں بلیک ہول کے ہولناک واقعے کا خفیف سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ایک کتاب یعنی "ریاض السلاطین" تو ایک انگریز عہدہ دار کی زیر سرپرستی مرتب کی گئی تھی اور دوسری کتاب "سیر المتاخرین" کا مصنف انگریزی قوم کا نہایت مداح اور طرفدار ہے اور سراج الدولہ اور اُس کے اہل دربار کے ظلم و ستم اور جہل و سفاہت کے بیان میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے؛

انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ جس کوٹھری میں ۱۴۶ انگریز قیدی رات بھر بند رہے وہ شکل سے ۱۸ گز مکسر تھی۔ اس میں صبح کو صرف ۲۳ آدمی زندہ ملے اور باقی سب تلف ہو گئے لیکن یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر قید کرنے والے ہندوستانی شدت سے ظالم اور شقی القلب تھے تو بھی وہ اتنے زندہ آدمیوں کو ایسی چھوٹی سی جگہ میں کیونکر بند کر سکے اور کیونکر اتنے لوگ ایسی تنگ جگہ میں سما سکے۔ مونسٹ اسمتھ صاحب اپنی نئی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ "اس قصے کو ایک من گھڑت کہانی ثابت کرنے کی اس زمانے میں جو کوشش کی گئی وہ پختہ دلائل پر مبنی نہیں ہے۔ بلیک ہول کا واقعہ ضرور پیش آیا گو اُس کے بعض جزئیات کافی طور پر یقینی نہ ہوں" لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس واقعے میں ظلم و اذیت کی نوعیت زیادہ تر ان جزئیات ہی پر موقوف ہے مثلاً اگر قیدیوں کی تعداد کم تھی تو اس واقعے کے ظلم ہونے میں تو جب بھی شبہ نہیں لیکن ظلم کی ہولناک شدت میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ بہر کیف یہ لائق

مؤلف سراج الدولہ کے متعلق اتنا ضرور لکھتا ہے کہ "انگریزی قیدیوں کو کال کوٹھری میں بند کرنے کا حکم نواب نے نہیں دیا تھا۔ البتہ اُس کا قصور یہ تھا کہ اپنے ماتحتوں کو اس فعل پر اُس نے کوئی سرزنش یا اس ہولناک نتیجے پر کوئی اظہار افسوس نہیں کیا" لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کلکتے کی تسخیر کے بعد سراج الدولہ اور انگریزوں کے مخالفانہ تعلق میں اتنی کمی ہو گئی تھی کہ لڑائی کے بعد سراج الدولہ کو اتنی قدرت یا مہلت ملی تھی کہ وہ اس وحشیانہ حرکت پر اپنے ملازموں کو سرزنش کرتا اور اپنا اظہار افسوس انگریزوں تک پہنچاتا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو اتنی مہلت اور قدرت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ کلکتے پر سراج الدولہ کے حملے کے متعلق (جس کے سلسلے میں بلیک ہول کا واقعہ) اور آخر جنگ پلاسی کے بعد خود سراج الدولہ کا نہایت بے رحمی سے قتل ہونا پیش آیا۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گو سراج الدولہ کے آتشیں مزاج اور کوتاہ اندیش ہونے میں کلام نہیں لیکن اس موقع پر ابتدا اسکی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے جب اس کے نانا الہ وردی خاں نے وفات پائی (۱۱۶۹ھ ۱۷۵۶ء) تو گو وہ اپنی زندگی میں سراج الدولہ کو ولی عہد بنا چکا تھا لیکن دستور کے مطابق بعض امرا اور اہل خاندان خفیہ یا علانیہ نئے نواب کے مخالف ہو گئے اور عجب نہیں کہ ملک میں شورش کے یہی آثار دیکھ کر انگریز تاجروں کو یہ جرأت ہوئی ہو کہ انھوں نے چند مجرمین کو جو بھاگ کر کلکتے میں پناہ گزین ہوئے تھے، نواب کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سراج الدولہ کی مسند نشینی سے دو مہینے بعد (شعبان ۱۱۶۹ھ) کا واقعہ ہے۔ خود وہ اس وقت راج محل کی طرف دورہ کرنے روانہ ہوا تھا کہ مذکورہ بالا اطلاع ملی اور نواب غضبناک ہو کر جہاں تھا وہیں سے جنوب کی طرف پلٹ پڑا اور ماہ رمضان المبارک (یعنی جون ۱۷۵۶ء) میں اس کی فوجیں انگریزوں کی تجارتی نوآبادی (کلکتہ) کے سامنے اس قدر جلد اور غیر متوقع طور پر نمودار ہوئیں کہ انگریز بھاگنے کے لئے کشتیاں بھی فراہم نہ کر سکے۔ جن سے نکلا گیا وہ نکل گئے[1] ورنہ ایک گروہ کثیر یہیں گرفتار ہوا اور ان کے تجارتی کارخانے کو نواب کی فوج نے دل بھر کر لوٹ لیا۔ کلکتہ کی حفاظت کیلئے

[1] بظاہر اسی ہلچل میں چند انگریز عورتوں نے ایک شخص امیر بیگ نامی کی پناہ لی تھی اور اس نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر جس طرح ممکن ہوا انھیں چھپا کر کلکتے سے باہر وہاں تک بحفاظت پہنچا گیا جہاں مفرور انگریزوں کی کشتیاں لنگر انداز تھیں اس جوانمردی اور احسان کا انگریزوں نے روپے سے معاوضہ کرنا چاہا تھا مگر امیر بیگ نے انکار کیا کہ میں نے یہ کام روپے کی طمع میں نہیں کیا بلکہ محض مقتضائے شرافت و انسانیت سمجھ کر کیا ہے۔۔۔۔ (سیر المتاخرین، صفحہ ۶۲۲)

نواب نے دیوان مانک چند کو مقرر کیا جو کہ "در جمیع امور بے شعور و از جوہر شجاعت ہم محروم" تھا۔ پھر دریا کی گزرگاہ پر چند فوجی چوکیاں مقرر کر کے مرشدآباد کو مراجعت کی ؛

کلکتے سے جو انگریز جان سلامت لیجا سکے تھے وہ فلتا میں ٹھیرے جہاں ولندیزوں کی تجارتی کوٹھی تھی یہیں مدراس سے ان کو فوجی کمک بھیجی گئی اور تھوڑے دن بعد فاتح ارکاٹ کلائیو (جو اب کرنل ہو گیا تھا) اور امیر البحر واٹسن ولایت کی تازہ دم فوج لیکر آ پہنچے۔ نواب کے سرداروں نے غالباً رشوتیں لیکر کلکتے کی مدافعت سے پہلو تہی کی اور تھوڑی سی گولہ باری ہوتے ہی یہ شہر پھر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا (۱۷۵۷ء مطابق ۱۱۷۰ھ) ؛

جنگ پلاسی

ان سرداروں ہی پر منحصر نہیں۔ سراج الدولہ کے اکثر درباری اُسکے خلاف غدر و بیوفائی پر آمادہ تھے۔ خود حکومت بنگالہ کا رکن رکین میر جعفر جو نواب کا رشتہ دار بھی تھا، اس کی بیخکنی کے درپے تھا اور درحقیقت اسی کے اصرار سے انگریزوں نے نواب کے خلاف سازش اور آخر میں مرشدآباد پر فوج کشی کرنے کی جرأت کی۔ انگریزوں کو اس بات کا اطمینان دلایا گیا تھا کہ ساری فوج سراج الدولہ کے خلاف ہے اور اس فوج کے مقابلے میں محض صف آرائی کرنا سپاہیوں کو منتشر کر دینے کے واسطے کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب انگریزی سپاہ مرشدآباد کے قریب (موضع پلاسی) تک بڑھی اور سراج الدولہ کو مقابلے کے واسطے باہر آنا پڑا، تو پچاس ہزار کے لشکر میں پانچ ہزار سپاہی بھی ایسے نہ تھے جنھوں نے نمک حلالی اور لڑائی میں شرکت کی ہو۔ اسی اندیشے سے نواب کو مرشدآباد سے باہر آنے میں پہلے ہی تامل تھا اور اب ہر چند اُسنے اپنے عہدہ داروں کی منت سماجت کی اور اپنے قصوروں کی معافی مانگ کر انھیں لڑائی پر آمادہ کیا، لیکن ان خود غرضوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور لڑائی صرف اس جمعیت کیساتھ ہوئی جو نواب کے وفادار بخشی میر مدن کے ماتحت تھی اور جس میں غالباً ایک ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے ورنہ باقی تمام فوج اپنی اپنی جگہ دور کھڑی لڑائی کا تماشا دیکھتی رہی، میر مدن کے ثبات قدم اور اُس کے پہلے دن کے حملے نے انگریزوں کو پریشان کر دیا تھا وہ میر جعفر کے وعدوں سے بدگمان ہو کر اپنے آپ کو اس جھگڑے میں پھنسانے سے پشیمان تھے لیکن جب انگریزوں کو میر مدن کے حملے نے پسپا کیا اور انھوں نے ایک اموں کے باغ میں پناہ لی کہ ممکن ہو تو رات کو نواب کی فوج پر چھاپہ ماریں۔ اسی وقت اتفاق سے توپ کے ایک گولے سے میر مدن نے مہلک زخم کھایا اور اس کے مرنے سے خود نواب کا دل چھوٹ گیا، وہ اسی شام کو

میدان جنگ سے نکل گیا۔ فوج کے اکثر سپاہی پہلے ہی لڑائی سے الگ رہے یا گھروں کو واپس روانہ ہو چکے تھے لہٰذا صرف چند دستے جنھیں نواب کے نکل جانے کی خبر نہ ہوئی تھی میدان میں رہے اور انہی سے معمولی زدوخورد کے بعد یہ مشہور "لڑائی" فتح ہو گئی! [1] (جون ۱۷۵۷ء مطابق شوال ۱۱۷۰ھ)۔

میر جعفر کی نوابی

ابنائے زماں کی عداوت نے سراج الدولہ کے ایسے حواس بگاڑ رکھے تھے کہ اسے بھاگنا بھی نہ آیا اور خشکی کے بجائے وہ تری کے راستے سے عظیم آباد جاتا تھا کہ راہ میں پکڑا گیا اور مرشدآباد میں لاکر قتل کرا دیا گیا۔ [2]

اب میر جعفر کی نوابی میں کوئی خرخشہ باقی نہ رہا اور اُس نے اپنے انگریز مددگاروں کو جس دریا دلی سے کے ساتھ انعام دیا وہ بنگالے کی تاریخ میں ضرب المثل ہے چنانچہ مشہور ہے کہ زر و اشرفی سے پوری ایک کشتی بھر کر کلکتے بھیجی گئی تھی جس میں سے پچیس لاکھ کے قریب صرف "ثابت جنگ کرنل کلیف" (یعنی کلائیو) کے حصّے میں آیا۔ کمپنی کو چوبیس پرگنہ" نامی ضلع کے حقوق زمینداری بھی حکومت بنگالہ نے عطا کیے اور اس کی آمدنی (تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ) کلائیو کے نام لکھدی۔

لیکن میر جعفر جسے اتنی آسانی اور محض سازش سے حکومت بنگالہ مل گئی ذاتی طور پر بالکل نااہل و نالائق آدمی تھا (خصوص درآں وقت کہ نشۂ بنگ بہ تائید جلوس بر مسند امارت بنگ دوبالا گشتہ" اس کو عیش و عشرت نے اور بھی بیکار کر دیا تھا۔ اِدھر ایک تو اسی زمانے میں شہزادۂ عالی گوہر (شاہ عالم) فتح بنگالہ کے ارادے سے بہار کے حدود میں داخل ہوا۔ اور دوسرے انہی دنوں کلائیو بنگالے کے "غنائم" سے مالا مال ہو۔ ولایت روانہ ہو گیا۔

---

[1] مذکورۂ بالا حالات سیر المتاخرین جلد دوم (صفحہ ۶۳۷ و ۶۳۸) سے لیئے گئے ہیں۔ نیز دیکھو کین کی تاریخ ہند جلد اوّل (۱۶۴ و ۱۶۵)، ریاض السّلاطین ۳۷۰ وغیرہ وغیرہ۔ پچیس تیس برس پہلے تک انگریز تاریخ نویس اس "فتح" پر نہایت فخر و ناز کیا کرتے تھے لیکن اب اکثر نئے مصنف اس سے ابا کرنے لگے ہیں۔

[2] وِنسنٹ اسمتھ صاحب اور بیشتر انگریز مورّخ لکھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے نہایت بیرحمی سے قیمہ قیمہ کرا دیا لیکن انھیں شاید یہ خبر نہیں کہ یہ قتل انگریزوں کی صوابدید و صلاح سے عمل میں آیا تھا (ریاض السلاطین صفحہ ۳۷۴)۔

(۱۷۶۰ء) میر جعفر کا سب سے بڑا حامی اور دوست وہی تھا مگر اس کے جانشین کو میر جعفر کی رفاقت ترک کرنے میں زیادہ نفع نظر آیا لہذا کلکتہ کونسل کے بعض ارکین کی خود غرضانہ مخالفت کے باوجود اُس نے میر جعفر کے داماد میر قاسم سے ساز باز کر لیا اور میر قاسم انگریزوں کی مدد سے[۵۱] بنگالے کا فرمانروا ہو گیا (۱۷۶۰ء مطابق ۱۱۷۴ھ)

میر قاسم سے مخالفت

نئے نواب نے رشوت میں زرِ کثیر کمپنی کے عہدہ داروں کو اور تین پرگنے یا ضلع خود کمپنی کو دیئے اور معاہدہ ہو گیا کہ ان پرگنوں کی آمدنی سے کمپنی ایک فوج مہیا رکھیگی کہ وقتِ ضرورت نواب کے کام آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ عہد و پیمان اور دوستانہ تعلقات درہم برہم ہو گئے۔ میر محمد قاسم کی انتظامی قابلیت کو قریب قریب ہر انگریز مورخ نے سراہا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ محض ملازمین کمپنی کی حرص نے اسے انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کیا اور اس پر بھی وہ حتی الامکان علانیہ لڑائی شروع کرنے سے بچنا چاہتا تھا اور مرشد آباد کے بجائے اس نے منگھیر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا کہ کلکتے کے انگریزوں سے دور ہو جائے لیکن حق یہ ہے کہ اُسے ان لوگوں سے معاملہ پڑا جن کی اس وقت تک کوئی منتظم مرکزی حکومت نہ تھی اور گو کلکتے میں رسمی طور پر ایک صدر کونسل قائم تھی لیکن درحقیقت کمپنی کی ہر کوٹھی کا منتظم اپنے آپ کو آزاد و خود مختار سمجھتا تھا اور کچھ کمپنی کے اور زیادہ تر اپنے ذاتی فوائد کی خاطر نواب بنگال کو دھمکی یا فریب سے آسامی بنانا چاہتا تھا مگر مناسب

---

[۵۱] اس عزل و نصب کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اور اس لیئے ذیل میں "ریاض السلاطین" کی روایت کا بجنسہ نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

میر محمد قاسم خاں بہ اتفاق جگت سیٹھ با سرداران انگریز ساختگی کردہ اظہار ابراں آورد کہ سرداران انگریز تاریخ ضیٰ خان منعزی الیہ شدہ بہ نواب جعفر علیخاں نوشتند کہ ہنگامۂ طلب تنخواہ سپاہ روبہ طولانی دارد بہتر آن ست کہ قلعہ و صوبہ بہ میر قاسم خاں سپردہ خود از قلعہ برخاستہ بہ کلکتہ بیائید میر محمد قاسم خان بہ دلجمعی تمام با حصول مطالب مراجعت بہ مرشد آباد نمود و سرداران سپاہ انگریز با وے موافق شدہ نواب جعفر علی خاں را از قلعہ بر کشتی سوار کردہ بہ کلکتہ رسانیدند۔۔" (صفحہ ۳۸)

[۵۲] یعنی مدنا پور بردوان اور چاٹ گام۔

ہوگا کہ اس قصے کو ہم انگریز مورخ گبن کی زبانی سنیں جس نے واقعات کو مختصراً تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے:۔ وہ لکھتا ہے کہ "عین اس زمانے میں جب کہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ہزیمت نصیب ہوئی، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی باہمی کشمکش کا طویل سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یعنی ۱۵ جنوری (۱۷۶۱ء مطابق جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ) کے دن پانڈی چیری کی فرانسیسی فوج نے کرنل کوٹ کی اطاعت قبول کرلی اور اس شہر پر قبضہ ہوتے ہی، مدراس کے انگریزی حکام کے حکم سے وہاں کے جنگی استحکامات فوراً منہدم کرا دیئے گئے"۔

نگران واقعات سے انگریزوں کو جو فرصت و اطمینان میسر آیا اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالے کے قابو چی عہدہ داروں کو دوبارہ دست درازی کرنے کی ہمت ہو گئی اور جس قدر روپیہ وہ میر قاسم سے اینٹھ سکتے تھے اُسے وصول کرنے کے بعد اب انھوں نے اسکے ساتھ اس قسم کے جھگڑے نکالے جو ذاتیات میں داخل تھے۔ مثلاً میجر کارنک نے نواب کی طرف سے شاہِ عالم کے خلاف جنگ تو شروع کی اور اس میں شکست دیکر بادشاہ کے فرانسیسی سردار لا کو قید بھی کر لیا لیکن دوسرے دن جب کارنک کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو ادھر تو شاہ عالم نے کمپنی کو پورے صوبۂ بنگالہ کی دیوانی دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ادھر کارنک اس کے ساتھ ایسے انکسار و لجاجت سے پیش آیا کہ میر محمد قاسم کو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے + + + اسیطرح جب کارنک کی بجائے کوٹ انگریزی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اس نے بھی عمداً ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے خواہ مخواہ میر قاسم کو رنج و پریشانی پیدا ہو اور اس طرزِ عمل میں پٹنے کے انگریزی کارخانے کا منتظم مسٹر ایلس بھی کوٹ کا مقلد تھا۔ جھگڑے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کا ہر ملازم اپنے تجارتی مال کو محصول راہداری سے مستثنیٰ کرانا چاہتا تھا حالانکہ یہ محصول نواب کے مداخلِ ریاست میں بہت معقول آمدنی کا ذریعہ تھا لیکن شاہِ عالم بادشاہ کی رضا جوئی بھی، رقابت کا ایک سبب بن گئی کیونکہ اس پریشان حالی کے باوجود شمالی ہند میں حکومت کا جائز وارث وہی تھا۔ اور گو انہی دنوں وہ اپنے برائے نام وزیر نواب شجاع الدولہ کے علاقے میں ہٹ آیا تھا۔ اور دو سال تک وہیں پناہ گزین رہا، پھر بھی ہر فریق کی اِسی "تاجدار بے ملک" کی طرف نگاہ لگی ہوئی تھی۔

آخر کار زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ کلکتے کے انگریز حکام کی میر قاسم سے اسی محصولِ

راہ داری پر علانیہ ان بن ہوگئی کمپنی کا انگریز عامل یا گورنر ون سٹارٹ اعتدال پسند آدمی تھا اور کلائیو نے اسے مدراس سے بلا کر اس عہدے پر اسی لیئے مقرر کرایا تھا کہ وہ کلکتہ کونسل،، کی ناجائز حرکتوں کی روک تھام کرے۔ اسی کونسل کا ایک اور فریاد رس وارن ہیسٹنگز بھی قابلیت کے ساتھ اس کی تائید کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کا ہم فلٹا کے پناہ گزینوں کے ساتھ پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ وہ دولت و اقتدار کی حرص سے مبرا نہ تھا بایں ہمہ ایسا بد اخلاق اور بے حمیت بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی ریشہ دوانیوں میں شریک ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ون سٹارٹ نے اسی کو منتخب کیا کہ جا کر نواب میر قاسم سے ملے اور مذکورہ بالا نزاع کو مصالحانہ طریق پر طے کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اس خیال سے کہ نواب کی ناراضی کے باعث معاملہ ذرا نازک ہو گیا ہے۔ ون سٹارٹ خود بھی گیا اور فیصلے کی یہ معقول شرائط قرار پائیں کہ خاص کمپنی کے مالِ درآمد و برآمد پر نواب کی طرف سے محصول نہ لیا جائے گا لیکن جو انگریز نج کے طور پر تجارت کرتے اور محصول سے بچنا چاہتے ہیں، اس کی ممانعت کر دی جائے گی۔ ون سٹارٹ ۲۸ جنوری ۱۷۶۳ء (۱۱۷۶ھ) کو کلکتہ واپس آگیا اور معلوم ہوتا تھا کہ معاملہ بالکل طے ہو گیا ... لیکن ادھر تو کلکتہ کونسل نے اس عذر پر کہ گورنر کو ایسے معاہدہ کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا، وہ شرائط منسوخ کر دیں اور اُدھر ایلس کو اجازت دے دی کہ وہ خاص خاص حالتوں میں فوجی قوت سے کام لے سکتا ہے، ایلس نے جنگ و جدال کا موقع نکالنے میں دیر نہ کی اور اس کے جواب میں نواب نے بھی اس کے سپاہیوں کی سرزنش کے واسطے ایک رسالہ روانہ کیا۔ ساتھ ہی ایک حکم شائع کر دیا کہ آئندہ سے محصول راہ داری انگریز و غیر انگریز کسی سے نہ لیا جائے گا تاکہ دیسی سوداگر بھی انہی کی مساوی شرائط پر تجارت کر سکیں (یہ وضاحت کر دینی چاہیئے کہ اس وقت کمپنی کا ہر عہدہ دار نج کی تجارت میں کچھ نہ کچھ حصہ لیتا تھا)

نواب کے اس حکمنامے کو ایلس اور اس کے بالادست (کلکتہ کونسل کے) عہدہ داروں نے، ون سٹارٹ اور ہیسٹنگز کے علی الرغم، کثرت رائے سے اعلان جنگ قرار دیا اور میر قاسم بھی اپنی جگہ پر آخر کار لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ مگر ((تصادم،، کی ابتدا ایلس ہی نے کی اور پھر خود بچ کر نکلنا چاہتا تھا کہ غضب ناک نواب کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا[۵]۔

[۵] کین۔ تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶۔

جنگ بنگالہ

گیبن نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر قاسم نے انگریز قیدیوں کو قتل کرا دیا اور یہی خبر پا کر کلکتہ کونسل نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور دوبارہ میر جعفر کو نواب بنایا۔ لیکن یہ غلط اور سخت غلط فہمی میں ڈالنے والی روایت ہے۔ کیونکہ کلکتہ کونسل نے فوجیں جولائی (۱۷۶۳ء) میں روانہ کیں۔ اور پہلی لڑائی بھی پلاسی کے قریب اسی مہینے میں ہوئی لیکن انگریز قیدیوں کا قتل ماہ اکتوبر کا واقعہ ہے[۱] اور خود گیبن کو اقرار ہے کہ اس کی بھی نواب نے پیش از پیش انگریز سپہ سالار کو اطلاع دے دی تھی کہ اگر پٹنے پر حملہ ہوا تو ان قیدیوں کی خیر نہ ہوگی۔

بہر حال، جنگ میں میر قاسم کی فوجوں کو دو تین مقامات پر پیہم شکست ہوئی۔ اس کے مستعد اور منتظم ہونے میں کلام نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر عہد میں اہل ہند کے طبقۂ اعلیٰ کے افراد سے فوجوں کو لڑانے کی قابلیت مفقود ہو گئی تھی اور میدان جنگ میں اُن کے چند سردار بھی اشتراک و اتحاد کے ساتھ کام نہ کر سکتے تھے۔ باہمی رقابت اور خود غرضی نے ان میں سخت نفاق پیدا کر دیا تھا اور سب سے آخری لڑائی میں جو اُدھوا نالے کے کنارے راج محل کے قریب ہوئی (ماہ صفر ۱۱۷۷ھ ۱۷۶۳ء) خود میر قاسم کا مشہور سردار میرزا نجف خاں انگریزوں سے مل گیا اور اسی کی رہبری سے چھپ کر انگریز راتوں رات ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے نواب کا لشکر توپوں کی زد میں تھا۔ اس شبخون میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور میر قاسم کی فوج کا شیرازہ بکھر گیا[۲]۔

حصول دیوانی

بنگالے کا شکست خوردہ حاکم (میر قاسم) بہار سے ہٹ کر ریاست اودھ کے علاقے میں چلا آیا تھا۔ اور شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کے معین و مددگار ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں والیِ اودھ نے آخر میں بے وفائی کی اور میر محمد قاسم کی فوج کو اپنے ساتھ ملا کر خود اُسے حراست میں لے لیا۔ اس طرح اگرچہ والیِ اودھ کی سپاہ میں نہایت معقول اضافہ ہو گیا تھا مگر جب اس نے بطور خود انگریزوں سے جنگ کی تو اس میں سخت شکست ہوئی اور بہار و بنگالے کی فتح تو ایک طرف، خود اس کی ریاست کے بعض اضلاع ہاتھ سے نکل گئے۔ کیونکہ مقابلہ بہار کی عین مغربی سرحد کے مقام

---

[۱] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۰

[۲] میرزا نجف کی غداری اور شبخون کے حالات سیر المتاخرین میں تفصیل سے تحریر ہیں (صفحہ ۷۴۱)۔ نیز دیکھو ریاض السلاطین ص ۳۸۳

بکسر پر ہوا (۱۱۷۸ھ مطابق ۱۷۶۴ء) فتحمند تعاقب کرتے ہوئے چنار و الہ آباد تک بڑھ آئے اوران مقامات پر بھی اُن کا بلا وقت قبضہ ہوگیا۔

لیکن انگریزوں کو لڑائی کا اصلی فائدہ یہ ہوا کہ شاہِ عالم والیٔ اودھ کا ساتھ چھوڑ کر انگریزی لشکر میں آگیا اور صوبۂ بہار و بنگال و اڑیسہ کی سندِ دیوانی دے کر اس نے انگریزوں کے قبضۂ بنگال کی تصدیق و توثیق کر دی، اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیئے کہ نواب میر جعفر کا اسی زمانے میں انتقال ہوا (جنوری ۱۷۶۵ء) اور گو کلکتہ کونسل نے اس خداداد موقعے پر بھی پہلے کی طرح اُس کے بیٹے (نجم الدولہ) سے بہت سی رشوتیں[۱] لے کر اُسے بنگالے کا نواب تسلیم کیا تھا مگر اسے کمزور و بے حقیقت دیکھ کر جب انھوں نے بالا ہی بالا شاہِ عالم سے دیوانی کی سند حاصل کر لی تو پھر بنگالے کا یہ نام نہاد نواب اپنے رہے سہے اختیارات سے بھی محروم ہو گیا۔

شاہِ عالم بادشاہ سے جو معاہدہ "عہد نامہ الہ آباد" کے نام سے انگریزوں نے کیا اس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ کوڑہ اور الہ آباد کے ضلعے جو انگریزوں نے والیٔ اودھ سے چھینے تھے، بادشاہ کے حوالے کر دیئے جائیں گے اور بہار و بنگال کی مالگزاری کے نام سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ بھی وہ بادشاہ کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں بادشاہ نے انگریزی کمپنی کو ان مشرقی صوبوں کا دیوان بنا دیا جس کا درحقیقت قانونی مطلب صرف یہ تھا کہ نواب (یا ناظم) بنگالہ کے ماتحت یا مددگار کی حیثیت سے اِن صوبوں کی سرکاری مالگزاری کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ البتہ بادشاہ نے مدناپور، بردوان وغیرہ چند پرگنوں پر (جو نواب کی طرف سے انہیں پہلے بطور جاگیر مل چکے تھے) کمپنی کا براہ راست قبضہ تسلیم کر لیا[۲]۔

۲ ۔ وارن ہیسٹنگز کا زمانہ

تحط ۱۷۷۰ء

شمال مشرقی صوبوں کی "دیوانی" کی سند کا حاصل ہونا گویا ہندوستان میں

---

[۱] گورنر ونسٹارٹ جس کی قابلیت کی بہت کچھ تعریفیں کی جاتی ہیں، اس رشوت ستانی میں شریک تھا اور اس کے حصے میں بھی پانچ لاکھ روپیہ آیا تھا (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۰ بحوالہ مل جلد سوم وغیرہ وغیرہ)۔

[۲] یہ شرطیں مل کی اور نیز حال کی بعض مفصل انگریزی تاریخوں میں موجود ہیں۔ بایں ہمہ اکثر انگریز تاریخ نویس اس "دیوانی" کے ملنے کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں گویا کمپنی کو اسی موقعے پر حکومتِ ہند کی سند مل گئی مگر یہ صحیح نہیں بے شبہ نواب نجم الدولہ کی نا اہلی اور بے بسی کی بدولت رفتہ رفتہ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئے لیکن عہد نامۂ الہ آباد کی رو سے

سلطنت انگریزی کی باضابطہ ابتدا ہے جس کے بعد ان پردیسی سوداگروں کا سیاسی دخل واقتدار برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ آخر کار وہ ممالک ہند کے بلا شرکت مالک اور خود مختار حاکم بن گئے۔
لیکن اس "مالی اقتدار" کے آغاز میں کمپنی کے ناتجربہ کار انگریز ملازمین کی زیادہ ستانی سے تین چار ہی سال میں نہ صرف یہ زرخیز و دولتمند صوبے مفلس رہ گئے بلکہ خود کمپنی کو سخت مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ ان انگریز ملازمین کی بے محابا رشوت و زرکشی کے حالات اکثر انگریزی تاریخوں میں موجود ہیں مگر کین کے الفاظ میں "انسان کے جبر و تشدد پر قہر الٰہی مستزاد ہوا اور ۱۷۶۹ء میں بارش کی کمی سے ایک فصل بگڑ گئی" ہندوستان میں امساک باراں کی وجہ سے پیداوار کا نہ ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ اس کا الزام حکومت کی بدنظمی کو دیا جا سکتا ہے لیکن پہلے مزارعین بالعموم خوش حال اور اجناس خوردنی کے اتنے کافی ذخیرے مکانات میں بھرے رہتے تھے کہ ایک دو فصلوں کی خرابی ایسی مہلک نہ ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے انگریز کمپنی کی مالی حکومت کے آغاز میں صرف ایک مرتبہ کی بارش نہ ہونے سے نہایت خوفناک قحط پڑ گیا (۱۷۷۰ء مطابق ۱۱۸۴ھ) سب سے زیادہ مصیبت (زرخیز و مرطوب ہونیکے باوجود) انھی صوبوں پر آئی جو چند سال سے انگریزی کمپنی کے زیر انتظام تھے چنانچہ انگریزی روایتوں کے بموجب اس ایک ہی قحط میں بنگالے کی ایک تہائی آبادی (یعنی ایک کروڑ نفوس) فاقہ کشی سے ہلاک ہو گئی اور اس خوفناک نقصان کی ایک ربع صدی میں بھی تلافی نہ ہو سکی بلکہ سالہا سال تک یہ آباد ملک ویران رہا۔[۱]

وارن ہیسٹنگز۔ اس قحط نے کمپنی کو بہت سی مالی مشکلات میں پھنسا دیا ناتجربہ کار ملازمین کی نااہلی اور بددیانتی سے پہلے ہی اس کے انتظامی معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گئی تھی جس کی اصلاح کے واسطے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۶۴) ان کی اصلی اور قانونی حیثیت محض "دیوان" کی تھی جو ناظم یا صوبہ دار کے ماتحت صرف صیغۂ مالگزاری کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کا بھی تحصیل مالگزاری کے سوا سالہا سال تک دیگر انتظامات میں براہ راست کوئی دخل نہ تھا۔

[۱] چنانچہ اس قحط کے تقریباً بیس برس بعد لارڈ کارنوالس نے بنگالے کی نسبت لکھا تھا کہ یہ ملک آج کل درندوں کا مسکن اور غیر آباد جنگل رہ گیا ہے! (مذکورۂ بالا تحریر کلا وجز، آکسفورڈ ہسٹری (صفحہ ۵۰۷) اور گزیٹیر (جلد ثالث صفحہ ۲۸۵) کے بیانات پر مبنی ہے۔ نیز و کھول کی تاریخ ہند جلد ثالث کین جلد اول صفحہ ۱۸۲ وغیرہ کو

کمپنی کے نظماء نے کلائیو کو دوبارہ کلکتے کا گورنر بنا کر ہندوستان بھیجا تھا اور یہاں دو سال رہکر اس نے اُن خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی واپسی (۱۷۶۷ئہ مطابق ۱۱۸۰ھ) کے بعد پھر وہی بدنظمی رونما ہوئی اور ادھر قحط نے کمپنی کو اس قدر مفلس کردیا کہ اسے بہت بڑی رقم حکومت انگلستان سے قرض لینی پڑی، اسی کے ساتھ نظماء کمپنی نے بنگالے میں اپنا گورنر مسٹر وارن ہیسٹنگز کو مقرر کیا کہ جہاں تک ہو سکے مذکورہ بالا خرابیوں کو دور کرے اور نالائق ملازمین کمپنی کو بلا رو رعایت سختی سے قواعد و ضوابط کا پابند بنائے۔ وارن ہیسٹنگز انگلستان کے ایک غریب و شریف خاندان کا آدمی تھا (پیدائش ۱۷۳۲ئہ) اور ۱۸ برس کی عمر سے کمپنی کا ملازم ہو کر ہندوستان آگیا تھا۔ کچھ عرصے وہ کلکتے اور مدراس کی کونسلوں میں رکن رہا اور اپنے فرائض کو اس نے ہمیشہ ایسی قابلیت سے انجام دیا کہ نظماء کمپنی کا یہ انتخاب بالکل مناسب ہوا تھا۔ یوں بھی اس کی گورنری کا زمانہ بہت سے اہم تاریخی واقعات کے باعث مشہور ہے اور کلائیو[1] کی طرح انگریز مصنفین وارن ہیسٹنگز کو بھی انگریزوں کی سلطنت ہند کا "معمار" یا بانی قرار دیتے ہیں۔

مگر اپنے تقرر کے بعد ہیسٹنگز اوّل اوّل اندرونی انتظامات کی درستی میں مصروف رہا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے "دیوان بنگالہ" کی حیثیت سے مرشد آباد کی بجائے کلکتے کو اپنا مستقر بنا لیا تھا لیکن ادھر تو ہیسٹنگز نے سابق عہد و پیمان کے خلاف بنگالے کے نام نہاد "نواب" کا سالانہ وظیفہ گھٹا کر آدھا کر دیا اور ادھر اس عذر پر کہ شاہ عالم بادشاہ الٰہ آباد کی سکونت چھوڑ کر دہلی چلا گیا اور مرہٹوں کو اپنا معین و مددگار بنا رہا ہے۔ اس نے وہ ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنا بھی موقوف کر دیا جس کی شرط پر شاہ موصوف سے دیوانی بنگالہ کی سند

[1] کلائیو جسے پلاسی کی "فتح" کے کچھ عرصے بعد لارڈ کا خطاب مل گیا تھا جب ہندوستان سے دوبارہ واپس گیا تو بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے مخالفوں نے وہاں اس پر غبن، خیانت مجرمانہ وغیرہ سنگین جرائم کے الزام قائم کئے اور بہت دن تک پارلیمنٹ میں اس کا مقدمہ ہوتا رہا جس پر موافق و مخالف مصنفین اپنے اپنے طور پر نہایت مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں ان حالات کا لکھنا بالکل بے محل ہوگا مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ پارلیمنٹ نے اس کو تمام الزامات سے بری کر دیا تھا لیکن پھر اسے طرح طرح کی تکلیف وہ بیماریوں نے آگھیرا اور ان تکالیف کو کم کرنے کی غرض سے وہ افیون کا بہت زیادہ استعمال کرنے لگا جس سے طبیعت اور بھی نڈھال رہنے لگی۔ تا آنکہ ۱۷۷۴ء میں اس نے اپنے مکان واقع لندن (برکلے اسکوائر) میں خود اپنا گلا کاٹ ڈالا۔ (آکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۴)

حاصل کی گئی تھی۔ اسیطرح اُس نے کمپنی کے اورمصارف میں بھی تخفیف وکفایت شعاری سے کام لیا اور مالگزاری وصول کرنے کے طریقے میں بعض اصلاحیں کیں نیز دیوانی اور مال کے جھگڑے چکانے کے لیئے اضلاع میں جابجا انگریزی عدالتیں قائم کردیں۔ لیکن فوجداری مقدمات کا فیصلہ اور عام انتظامات ابھی تک نواب یا ناظم بنگالہ کے ہندوستانی عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھے اگرچہ انھیں میرجعفر کے بعد سے درحقیقت انگریزوں ہی کا ملازم سمجھنا چاہیئے۔

تنظیم حکومت کی ابتدا

ادھر یہی ہیسٹنگز کی گورنری کا زمانہ ہے جس میں انگلستان کی حکومت کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے مالی اور انتظامی مسائل کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کے متعلق سب سے پہلا تنظیمی قانون ("قانون تنظیمی مجریہ ۱۷۷۳ء") پارلیمنٹ میں مرتب اور منظور ہوا جو ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت کی پہلی بنیاد ہے۔ اس قانون کے چند حصے ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں یعنی ایک تو وہ حصہ ہے جس میں نظمائے کمپنی کے انتخاب اور سرکار سے تعلقات وفرائض کی صراحت کی گئی ہے اور جس کی قابل ذکر شرائط یہ ہیں کہ آئندہ سے نظمائے کمپنی کا فرض ہوگا کہ اپنی آمدوخرچ کے گوشوارے اور تمام ضروری خط کتابت کی نقول مجلس وزرا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ لیکن خاص ہندوستان سے متعلق قانون کا وہ حصہ ہے جسکی رو سے کمپنی کے ایشیائی مقبوضات کو چار احاطوں یا "پریسی ڈنسیوں"[۱] میں تقسیم کیا اوران میں "صدر احاطہ" بنگال (فورٹ ولیم، کلکتہ) کو قرار دیا ہے۔ اسی کے حاکم اعلیٰ کو "گورنر جنرل" کا لقب دیا گیا کہ وہ اپنے علاقے کے اندرونی انتظامات کے علاوہ دوسرے احاطوں پر بھی نگرانی رکھے اور وہاں کے حکام (خاص خاص ناگہانی صورتوں کے سوا) اس کی رائے کے بغیر کوئی جنگ وصلح نہ کرسکیں۔ لیکن اس نگرانی اور انتظام کا حصہ گورنر جنرل کی ذاتی رائے پر نہ تھا بلکہ اس قانون کی رو سے گورنر جنرل ہر معاملے میں اپنی "کونسل" یا مجلس انتظامی کے چار ارکین کے مشورے کا محتاج تھا اور تمام معاملات اسی مجلس میں ارکین کی کثرت رائے کے بموجب طے پاتے تھے۔

---

[۱] یعنی کلکتہ، مدراس، بمبئی، اور بن کولن (جزیرہ سماٹرا) جسے بعد میں ولندیزوں کے حوالے کردیا گیا۔ واضح رہے کہ اردو میں "پریسی ڈنسی" کا ترجمہ "احاطہ" کرتے ہیں لیکن یہ لفظ مفہوم اصلی سے بہت دور اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے اور ہمارے ہاں غالباً اس کا بہتر مرادف "نظامت" یا "ولایت" ہوتا۔

نئے انتظامات کے ساتھ اسی قانون کی رُو سے کلکتے میں ایک "عدالتِ عالیہ" بھی قائم کی گئی جس میں اوّل اوّل ارکین عدالت کے انتخاب و تقرر کا حق حکومت انگلستان کو دیا گیا تھا اور پہلا شخص جو میر مجلس مقرر ہوا وارن ہیسٹنگز کا ہم مکتب اور دوست سر ایلجا امپے تھا۔ یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان ملکی اور عدالتی عہدہ داروں کی بڑی بیش قرار تنخواہیں مقرر کی گئی تھیں جنہیں بعد میں گھٹانا پڑا۔

اس اثنا میں (قانون تنظیمی کے نافذ ہونے سے قبل) نواب وزیر اور والئ اودھ اور روہیلوں کا وہ جھگڑا شروع ہو گیا تھا جس میں انگریز بھی نواب وزیر کے حلیف بن کر شریک ہو گئے۔ دراصل شاہ عالم بادشاہ کے دلی آنے کے بعد جب مرہٹوں کا رسوخ بڑھا تو انھوں نے روہیلہ رئیسوں کو نہ صرف دربار دلی سے خارج کر دیا بلکہ خود اُن کے علاقوں پر یورشیں کرنے لگے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس موقع پر والئ اودھ اور ان پٹھان رئیسوں کو مصلحت یہی نظر آئی کہ اپنی گذشتہ رقابت و دشمنی کو بھلا کر مرہٹوں کے خلاف متحد ہو گئے (۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۲ء) اسی ضمن میں نواب نے انگریزی فوج سے بھی مدد لی۔ کہتے ہیں کہ روہیلوں نے والئ اودھ کو اپنی اعانت کے معاوضے میں چالیس لاکھ روپے دینے کا عہد کیا تھا لیکن جب مرہٹوں کا حملہ پسپا ہو گیا تو روہیلے اپنے اقرار سے پھر گئے اور والئ اودھ نے اُن کے مقابلے کے لیئے انگریزوں سے ایک نیا معاہدہ کیا (عہدنامہ بنارس ۱۷۷۳ء مطابق ۱۱۸۷ھ) اس معاہدے کے مطابق سال آئندہ انگریزوں نے زر کثیر کے عوض میں ایک جیش (بریگیڈ) والئ اودھ کی مدد کو بھیجا اور اودھ کی فوجوں نے روہیلکھنڈ پر فوج کشی کی سب سے بڑی لڑائی میراں کٹرے (ضلع شاہجہاں پور) کے مقام پر ہوئی (۱۷۷۴ء) اور اسی میں روہیلوں کا نامور سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا۔ والئ اودھ کو فتح ہوئی اور ریاست رامپور کے سوا روہیلکھنڈ کے قریب قریب تمام علاقے پر نواب وزیر والئ اودھ کا قبضہ ہو گیا۔

اس عہد کی لڑائیاں: (۱) جنگ روہیلہ

(۲) پہلی جنگ مرہٹہ

اسی زمانے میں بمبئی کے انگریزوں کو مرہٹوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا موقع اس طرح ملا کہ چوتھے پیشوا مادھو راؤ کی وفات (۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء) کے چند روز بعد پونا میں بہت سے خانگی فساد پیدا ہو گئے اور انہی جھگڑوں میں ایک سال کے اندر پانچویں پیشوا نرائن راؤ کی جان گئی (۱۷۷۳ء)۔ چونکہ وہ لاولد تھا اس لیئے اب اس کا چچا

رگھوناتھ راؤ یا رگھوبا پیشوا بنایا گیا لیکن تھوڑے ہی دن میں معلوم ہوا کہ نراین راؤ کی بیوہ گنگا بائی حاملہ ہے لہذا ایک جماعت نے رگھوبا کو پیشوا ماننے سے انکار کر دیا اور بچے کی ولادت اور جوان ہونے تک گنگا بائی کو بچے کی اتالیق و سرپرست کی حیثیت سے اپنا حکمراں ماننے لگے۔ مگر اختیارات کی باگ نانا فرنویس[۱] کے ہاتھ میں آگئی اور وہی گنگا بائی کے نام سے رفتہ رفتہ حکومت کا مختار کار بن گیا۔ گنگا بائی کے حاملہ ہونے اور بعد میں اس کے بیٹے کی ولادت کا جب اعلان ہوا تو رگھوبا ریاست حیدرآباد و میسور سے لڑنے گیا ہوا تھا اور اس نے ان سب خبروں کو غلط اور محض اپنے دشمنوں کا جعل سمجھا لیکن اتنی دیر میں کہ وہ میسور سے واپس پونا آئے، گنگا بائی کی نئی حکومت مضبوطی سے قائم ہو چکی تھی اور اکثر مرہٹہ سردار نراین راؤ کے نوزائیدہ بچے مادھو راؤ نراین کو خواہ وہ اصلی تھا یا جعلی، پیشوا مان چکے تھے۔ لہذا رگھوبا اپنے مقصد میں ناکام رہا اور شمالی دکن کے علاقوں میں ہٹ گیا کہ ازسرِ نو جنگی تیاریاں کرے۔

انھی تیاریوں کی ضمن میں رگھوبا کو بمبئی کے انگریزوں سے مدد لینے کا خیال آیا اور انھوں نے اس کے معاوضے میں سالسٹ اور بسین کی بندرگاہیں طلب کیں۔ بلکہ معاہدے کی تکمیل سے قبل ہی سالسٹ پر اچانک حملہ کر کے قابض ہو گئے (دسمبر ۱۷۷۴ء مطابق ۱۱۸۸ھ) یہ عہد نامہ اور جنگ کی ابتدا کلکتہ کونسل کے بغیر اجازت کی گئی تھی اور کلکتہ کونسل نے ادھر تو بمبئی کے حکام کو (جو نئے قانون کی رو سے ان کے ماتحت تھے) لڑائی سے روکنا چاہا اور ادھر اپنے ایلچی پونا بھیجکر وہاں کی حکومت سے مصالحت کر لی۔ (عہد نامہ پورندھر) لیکن اول تو بمبئی کی کونسل نے اس معاہدے کو نہ مانا دوسرے کچھ عرصے کے بعد خود نظمائے کمپنی نے بمبئی کے انگریزی حکام کی تائید کی اور آخر میں کلکتہ کونسل نے بھی اجازت دے دی کہ بمبئی کی کونسل مرہٹوں کے تنازعات میں جس طرح

[۱] نانا فرنویس کا اصلی نام بالاجی جنارون ہے وہ مرہٹوں کے اعلیٰ طبقے کا فرد تھا۔ ۱۷۶۴ء میں پیشوا کے وزرا میں داخل کیا گیا اور اپنی قابلیت سے بہت جلد حکومت پونا کا سب سے ذی اثر رکن بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ پونا کے خانگی جھگڑے بپا کرنے میں اس کی بھی شرکت تھی لیکن مجموعی طور پر وہ سچا محب وطن اور نہ صرف مرہٹوں میں بلکہ اپنے تمام معاصرین اہل ہند میں نہایت ممتاز و مدبر گزرا ہے۔

نامناسب سمجھے کام کر سکتی ہے[1] کو

مرہٹہ سرداروں میں درحقیقت بلا کا نفاق پیدا ہوگیا تھا اور اسی لیئے انگریزوں کی یہ اُمید بیجا نہ تھی کہ رگھوبا کے علاوہ اور کئی سردار اُن کے طرفدار ہو جائیں گے۔ ابتدا میں بمبئی سے جو فوجیں بڑھائی گئیں اُن کی اس اندرونی نااتفاقی کی وجہ سے کوئی قابل ذکر مزاحمت بھی نہ ہوئی اور وہ مختلف مقامات کو لیتی ہوئی پونا کے بالکل قریب (اٹھارہ میل پر) آپہنچیں۔ بلکہ گرانٹ ڈف کی تحریر سے پایا جاتا ہے کہ خود اس شہر پر ان کا قبضہ ہو جانا کچھ دشوار بات نہ تھی۔ بایں ہمہ انگریزی تاریخوں کی روایات کے بموجب انگریز افسر محض اس وہم سے کہ آیندہ سخت جنگ پیش آئے گی خوف زدہ ہو گئے اور اپنی بڑی توپیں ایک تالاب میں ڈبو کے پسپا ہونے لگے[2]!

عہدنامہ "وڈگاوں"

اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ اگر یہ پسپائی کسی شکست کا نتیجہ نہ تھی تو غالباً اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کو خود مرہٹہ سرداروں کے مل جانے اور مدد دینے کی جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور ان کو سلامتی اسی میں نظر آئی کہ اُلٹے پاؤں واپس ہو جائیں۔ لیکن مرہٹے اگر ان کی پیشقدمی کے وقت چپ تھے تو پسپائی کے وقت خاموش نہ رہے اور چند ہی روز میں اپنے پیہم حملوں سے انھوں نے انگریزوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر جن شرطوں سے انگریزی افواج کو صحیح سلامت واپس جانے کی اجازت ملی وہ "عہدنامہ وڈگاوں" کی صورت میں قلم بند کی گئیں اور انگریزوں نے رگھوبا کی مدد اور مرہٹوں کے جن شہروں پر قبضہ تھا سب سے ہاتھ اٹھا لیا (جنوری ۱۷۷۹ء مطابق ۱۱۹۳ھ)

واضح رہے کہ اس معاہدے کی تکمیل کے وقت بھی مہاداجی سندھیا اور نانا فرنویس کی باہمی رقابت نے مرہٹوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اگر انگریز بالکل ہی مغلوب و مجبور نہ ہو جاتے تو انھیں اس نااتفاقی سے فائدہ اٹھانے کی بہت گنجایش تھی۔ چنانچہ گو وہ اپنے دو انگریز عہدہ داروں کو بطور یرغمال مرہٹوں کے حوالے کر آئے تھے لیکن خطرے سے

---

[1] گرانٹ ڈف۔ جلد دوم صفحہ ۵۶ و ۳۵۵ - واضح رہے کہ وارن ہیسٹنگز اس معاملے میں اوّل سے بمبئی کونسل کا مؤید تھا۔ لیکن کلکتہ کونسل کے دیگر اراکین مرہٹوں سے لڑائی مول لینے کے خلاف تھے اور ان کی کثرت رائے نے ہیسٹنگز کو مجبور کر دیا تھا۔

[2] گرانٹ ڈف۔ جلد دوم صفحہ ۳۷۰ -

مقامات سے باہر آتے ہی انھوں نے عہدنامے کی شرائط بھلا دیں اور کلکتہ کونسل نے بھی اس عہد و پیمان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ایک بڑی فوج روانہ کی کہ پچھلی شکست و ناکامی کا بدلا لے یہ فوج آئندہ تین سال تک مالوے، گجرات اور دکن کے علاقوں میں معروف کارزار رہی

شہنو سو کے اور صلح

بمبئی اور مدراس کی مقامی انگریزی افواج اس سے آملی تھیں اور بڑودہ کی مرہٹہ ریاست کا ایک مدعی (فتح سنگھ) انگریزوں کا حلیف و مددگار ہوگیا تھا جس کی مدد سے احمد آباد اور گجرات کے دیگر مقامات پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوئی، گوالیار کے قلعے پر بھی ایک انگریزی دستے کے سپاہی رات کے وقت چھپ کر چڑھ گئے تھے اور گوہد کا رانا سندھیا کے خلاف ان کا مددگار ہوگیا تھا لیکن سندھیا سے اصلی جنگ کچھ مدت بعد سرونج کی نواح میں ہوئی جہاں کرنل کامک اور اس کی فوج کو سندھیا نے گھیر لیا اور یہ انگریز افسر بہ شکل شب خون مار کے محاصرے سے نکل سکا۔

خاص حکومتِ پونا کے علاقوں میں، انگریزی سپہ سالار گوڈرڈ نے بسین کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اسی شہر کے قریب رام چندر گنیش اور کرنل ہارٹلے کے کئی مقابلے ہوئے۔ فریقین کے فوجی سرداروں میں یہ دونوں بڑے من چلے اور کارواں سپہ سالار مانے جاتے تھے اور ان کے ماتحت سپاہیوں نے بھی بہادری کا حق ادا کر دیا لیکن ایک معرکے میں جب کہ مرہٹوں کی فتح بالکل قریب نظر آنے لگی تھی گنیش مہلک زخم کھا کے گرا اور اس کی موت نے سپاہیوں کی ہمت پست کر دی۔ ادھر غالباً اسی حملے کی ناکامی کے بعد بسین کے مرہٹہ مدافعین مایوس ہوگئے اور یہ شہر تسخیر ہوگیا۔

ان شمالی علاقوں سے ایک حد تک اطمینان حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے پورے ساز و سامان سے پونا پر پیشقدمی اور کوکن کی پہاڑیوں کو عبور کرنے کا قصد کیا اور اسی کوشش میں جنرل گوڈرڈ کو وہ ناکامی ہوئی جسے مرہٹے تو اپنی بہت بڑی فتح بتاتے ہیں اور انگریز فقط ایک ناکامیاب حملے کے بعد "پسپائی"، کہتے ہیں اگرچہ یہ انگریز مورخوں کو بھی اقرار ہے کہ اس پسپائی میں انگریزی سپاہ کو سخت نقصانات برداشت کرنے پڑے[۱] بہرحال

[۱] یہ تمام حالات گرانٹ ڈف کی مفصل "تاریخ مرہٹہ"، سے ماخوذ ہیں (جلد دوم باب سیزدہم) اور حال کی انگریزی تاریخوں سے بھی ان کا مقابلہ کر لیا گیا ہے (مثلاً دیکھو کین جلد اول۔ باب نہم۔ فصل سوم وغیرہ)۔

یہ انگریزی حملہ ناکام رہا اور اِدھر دکن کی چاروں بڑی ریاستیں انگریزوں کے خلاف متحد ہوگئیں ان میں سے نواب نظام الملک (آصف جاہ ثانی) اور مدا جی بھونسلے کو تو انگریزوں نے مختلف تدابیر سے رضامند کر لیا مگر حکومت میسور نے پونا والوں کا ساتھ نہ چھوڑا اور انھی کی ہمدردی میں انگریزوں کے ساتھ وہ جنگ چھیڑ دی جس کا حال آگے آتا ہے (۱۷۸۰ء مطابق ۱۱۹۴ھ)

عہد نامۂ سالبائی (یا سلبئی)

گوڈرڈ نے ایک مرتبہ اور پونا پر بڑھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن دوبارہ ناکامی ہوئی اور اوّل تو اس تین سال کی جنگ و جدال میں کمپنی کا خزانہ خالی ہوگیا اور دوسرے حیدر علی والئ میسور کے پیہم حملوں کی ضربات نے مدراس کے انگریز حکام کو نہایت ہراساں کر دیا لہذا وارن ہیسٹنگز کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ جس طرح ممکن ہو مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے۔ اس کی طرف سے صلح کی تحریک پہلے بھی ہوئی تھی لیکن حکومت پونا نے حیدر علی کی رائے کے بغیر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور سچ یہ ہے کہ اس موقعے پر اگر مہاداجی سندھیا اپنی ذاتی اغراض کی خاطر حکومتِ پونا پر زور نہ ڈالتا تو وہ اپنی اسی حکمت عملی پر قائم رہتی مگر نانا فرنویس اپنی مرکزی حکومت کی اندرونی کمزوری سے واقف تھا اس لیئے آخر کار وہ بھی ان شرائط صلح پر رضامند ہوگیا جو حکومتِ پونا کی طرف سے سندھیا نے انگریزوں کے ساتھ طے کی تھیں۔

(عہد نامۂ سالبائی مرتبہ ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۶ھ) ؎

اس معاہدے کی قابل ذکر شرطیں یہ تھیں کہ انگریز، سالسٹ کے سوا مرہٹوں کے تمام شہروں سے جن پر قبضہ کر لیا تھا، دست بردار ہوگئے حکومت پونا نے رگھوبا کا تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور انگریزوں کے حلیف فتح سنگھ (گائکواڑ) کو گجرات کا رئیس مان لیا۔ بہ الفاظ دیگر، جو صورت جنگ شروع ہونے سے پیشتر تھی بظاہر وہی بحال رہی۔ بلکہ انگریز کسیقدر خسارے میں رہے لیکن درحقیقت اس معاہدے نے دوستی کا پردہ ڈالکر مرہٹوں کو دیگر ممالک ہند سے ایسا بے دخل کر دیا کہ آئندہ بیس برس تک انگریز اطمینان کے ساتھ میسور و کرناٹک نیز اودھ کے علاقوں پر قبضہ جماتے اور اپنی قوت بڑھاتے رہے اور مرہٹوں نے ان کی مزاحمت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جب دوبارہ انگریز مرہٹوں کے مقابلے میں اُترے تو حکومت پونا کو اس غفلت یا[۱] غیر جانب داری، کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور وہ اپنے حریف کی اضافہ شدہ طاقت سے عہدہ برآ نہ ہوسکی؎

مجاہدانِ میسور

مرہٹوں کی یہ صلح والئ میسور کے لیئے سب سے زیادہ مایوس کن اور مُضر تھی جیسا کہ ہم

بیان کر چکے ہیں اس موقع پر اُس نے مرہٹوں کی تحریک سے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی تھی اگرچہ مخاصمت کے اور اسباب بھی موجود تھے لیکن ان اسباب اور اس دوسری جنگ میسور کے حالات لکھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اس جگہ پہلی جنگ میسور کے واقعات بھی بیان کردیں کہ انگریزوں اور حیدر علی کے باہمی تعلقات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

انگریزی تاریخوں سے یہ بات صاف صاف نہیں معلوم ہوتی کہ پہلی جنگ میسور کی اصلی وجوہ کیا تھیں۔ یہ سچ ہے کہ بنگال و کرناٹک میں انگریزوں کا فروغ دیکھکر ہندوستان خاص کر دکن کے رئیسوں کو اُن سے عداوت پیدا ہوئی ہوگی لیکن آغاز جنگ کے وقتی اسباب کے متعلق ہماری معلومات بہت ناکافی اور مشتبہ ہے۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ اوّل اوّل اس جنگ میں نواب نظام الملک نے بھی حیدر علی کی مدد کی اور ۱۷۶۷ء (اواخر ۱۱۸۱ھ) میں لڑائی شروع ہوگئی۔

میسور کے انگریزی محاربات میں یہ بات خاص طور پر طالب علم کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ریاست میسور کے پاس بحری جنگ کا کوئی معقول ساز و سامان نہ تھا اور اس کے طویل مغربی ساحل پر جہازوں کے ذریعے بلا دقّت فوج اتاری جاسکتی تھی۔ اس طرف سے حملہ کرنے کے لیئے انگریزوں کا مستقر بمبئی بالکل قریب تھا اور اسی طرح مشرق میں مدراس پہلے ہی ان کی حکومت و قوّت کا مرکز بن گیا تھا جہاں سے میسور پر چڑھائی کرنے میں کچھ دشواری نہ تھی کیونکہ کرناٹک اُن کے زیر اثر آچکا تھا، خلاصہ یہ کہ میسور کا دونوں طرف سے انگریزوں کی زد میں ہونا ان کی بڑی جیت تھی۔

چنانچہ میسور کی پہلی جنگ میں بھی اگرچہ بمبئی کی طرف سے کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا تاہم وہاں کے انگریز حکام نے منگلور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بغاوت کرادی جن پر قریبی زمانے میں حیدر علی کا قبضہ ہوا تھا، ادھر مشرق کی طرف سے کئی انگریزی فوجیں مختلف رستوں سے میسور کے علاقوں میں گھس گئیں اور انھوں نے ہر جانب سے بنگلور کی سمت بڑھنا شروع کیا، گوٹی (ضلع اننت پور) کا مشہور مرہٹہ رئیس مرار راؤ (گھور پڑے) نواب محمد علی کا ساتھ دے چکا تھا بعض خانگی تنازعات کی وجہ سے اس کا ادنیٰ صدر حکومت (دیونا) سے تعلق برائے نام رہ گیا تھا اور اسی نیم خود مختاری کی وجہ سے بذات خود ایک بڑی فوج مہیا رکھنی پڑتی تھی۔ لہٰذا جب وہ بھی انگریزوں کا شریک

کرناٹک کے علاقوں پر حملہ کرنے میں حیدر علی سے مدد مانگی تو اس نے انکار کر دیا۔ اور ان کے ارادوں کی انگریزوں کو (اپنا حلیف سمجھ کر) اطلاع دے دی[1]۔ مزید برآں، وہ انگریزوں کی جانب سے ایسے منافی عہد یا سرد مہری کا سلوک دیکھکر بھی اُن سے بگاڑنی نہ چاہتا تھا کہ اتنے میں اوّل تو انگریزوں نے فرانس کے ساتھ جنگ ۱۷۷۸ء کے دوران میں ماہی کی بندرگاہ پر حملہ کیا اور ادھر کچھ عرصے بعد نواب نظام الملک اور مرہٹوں نے والی میسور پر زور ڈالا کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف شریک جنگ ہو جائے۔

اس جگہ یہ وضاحت کر دینی چاہیئے کہ گو ماہی کا چھوٹا سا قصبہ فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا لیکن حیدر علی کے علاقے میں ہونے کی وجہ سے وہ اُسے اپنے زیر اثر سمجھتا تھا اور میسور کے جنگی ساز و سامان کی درآمد بھی زیادہ تر اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ نظر بریں حیدر علی نے پیش از پیش انگریزوں کو اطّلاع دے دی تھی کہ اس مقام پر حملہ نہ کیا جائے اور مدراس کا گورنر سر ٹامس بھی والئ میسور کے خلاف مشابہ کارروائی کرنی نہ چاہتا تھا لیکن انگریزی فوج کے سپہ سالار نے سر ٹامس کی رائے نہ چلنے دی اور ماہی پر بحری حملہ کر کے چند روز کے لیئے قبضہ کر لیا حالانکہ وہاں ریاستِ میسور کا پھریرا لگا ہوا تھا اور میسوری سپاہی بھی حیدر علی کی طرف سے اس بستی کی حفاظت کیلئے بھیجے گئے تھے[2]۔

"آخر کار حیدر علی نے جنگ کا قصد کر لیا"، اور نواب نظام الملک اور مرہٹوں کی طرف سے فتح کرناٹک کا جو کام اس کے سپرد کیا گیا تھا، اسے انجام دینے کی وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں[3]۔ جولائی ۱۷۸۰ء (۱۱۹۴ھ) سے میسور کی دوسری جنگ شروع ہو گئی اور تقریباً چھ سال تک اس کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان حالات کو تفصیلی طور پر لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چند اہم واقعاتِ جنگ بیان کرنے کافی ہونگے کہ اس جنگ میں حملے کا آغاز حیدر علی کی طرف سے ہوا اور میسوری افواج کرناٹک

---

[1] دیکھو کتاب نذلور صفحہ ۴۲

[2] یہ حالات بٹورنگ (صفحہ ۸۴) اور کسفورڈ ہسٹری (صفحہ ۵۴۴) اور کین (جلد اول صفحہ ۲۱) کے بیانات سے جمع کیئے گئے ہیں۔

[3] بٹورنگ کا بیان ہے کہ حیدر علی نے اس موقع پر تراسی ہزار فوج مہیّا کر لی تھی (صفحہ ۸۰) مگر اس شمار میں مولف نے بائیس ہزار چیر اسی یا برقنداز (؟) بھی شامل کر دیئے ہیں۔ فوج کی رسد رسانی کا نہایت عمدہ اہتمام کیا گیا تھا اور اس محکمے کا تمام انتظام حیدر علی کے معتمد علیہ دیوان پورنیا کے سپرد تھا۔

ہوگیا تو اُن کی قوت بہت بڑھ گئی اور حیدر ابتدائی کامیابیوں کے بعد وہ خاص سری رنگ پٹن فتح کرنے کے منصوبے سوچنے لگے لیکن حیدر علی کی حیرت انگیز کاروانی اور دلیری نے تھوڑے ہی دن میں ان منصوبوں کو باطل کر دیا اور جس آسانی سے انگریزی فوجیں میسور میں بڑھی تھیں اسی تیزی سے پسپا ہونے لگیں حالانکہ درحقیقت اب تک حیدر علی صرف غنیم کی یورش روک رہا تھا، مگر اس کے بعد جب خود اس کے حملہ کرنے کی باری آئی تو گویا وہ انگریزوں پر برس پڑا اور اس شدت و سرعت سے جابجا انگریزی فوجوں پر حملے کیئے کہ انہیں بچ کر نکلنا دشوار ہو گیا۔

حیدر علی کی اس چیرہ دستی نے ۶۹ئہ (۸۲ و ۱۱۸۱ھ) میں لڑائی کا رنگ بدل دیا۔ اب انگریزی فوجیں ہر طرف سے نقصان اٹھا اٹھا کے واپس ہو رہی تھیں اور ان کی دفاعی قوت اس قدر مضمحل ہو گئی تھی کہ جب حکومت مدراس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی تو حیدر علی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خود مدراس آرہا ہوں تمھیں جو کچھ کہنا ہو وہیں کہنا! اور یہ فقط دھمکی نہ تھی بلکہ چند ہی ہفتے میں حیدر علی نے جو کچھ کہا تھا، کر دکھایا۔ ہندوستان کی جنگی تاریخ میں اس کی وہ یلغار مشہور ہے جس میں ایک دن کے اندر وہ اکتیس میل طے کر کے مدراس کے سامنے آپہنچا اور وہاں کے خوف زدہ انگریز حکام سے اپنی من مانی شرطیں تسلیم کرالیں ہوا (عہد نامہ مدراس۔ مارچ ۶۹ئہ مطابق ۱۱۸۲ھ)

میسور کی دوسری جنگ

انہی شرطوں میں ایک یہ بھی تھی کہ اگر ایک فریق پر کوئی بیرونی حملہ ہوگا تو دوسرا فریق اس کی مدد کرے گا۔ مگر صلح کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر کئی حملے کیئے اور حیدر علی کو بہت سی مشکلات و مصائب کا سامنا ہوا تو انگریزوں نے اس کی اعانت نہ کی۔ اس نقض عہد کا قریب قریب ہر انگریز مورخ نے اعتراف کیا اور اس کا الزام مدراس کونسل کے انگریز ارکین پر الزام لگایا ہے لیکن میسور کے سابق چیف کمشنر مسٹر بورنگ جن کی کتاب "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" سے ہم نے یہ حالات لکھنے میں مدد لی ہے صراحت کرتے ہیں کہ خود حیدر علی نے اپنی طرف سے ہمیشہ مذکورۂ بالا معاہدے کی پابندی کی اور مرہٹوں نے

ا؎ انگریزی روایات کے بموجب ان لڑائیوں میں سب سے بڑا معرکہ ارونڈ کے قریب ہوا تھا جہاں انگریزی سردار کیمبن کو کامل شکست ہوئی اور اس کی فوج میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مقتول یا زخمی نہ ہوا ہو (دیکھو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" (رولرز آف انڈیا) صفحہ ۵۶۔)

کی سرحدی فوجوں کو شکست دیتی ہوئی کنجی ورم (کانچی) کے قریب تک بڑھ آئیں۔ اسی شہر کے جنوب میں فریقین کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں جن میں حیدر علی کو فتح ہوئی (ستمبر ۱۷۸۰ء مطابق ۱۱۹۴ھ) انگریز سپہ سالار (سر ہکٹر منرو) نقصان کثیر اٹھا کے مدراس چلا آیا اور حیدر علی نے کنجی ورم تک سارا شمالی کرناٹک تاراج و پامال کر دیا ؛

سال آئندہ حیدر علی کے مقابلے میں انگریزی فوج کی سپہ سالاری سر آئر کوٹ کو تفویض کی گئی جو اس زمانے میں بہت لائق و کامیاب فوجی افسر مانا جاتا تھا اور بے شبہ اس نے گذشتہ ناکامیوں کی ایک حد تک تلافی کی اور پورٹو نوو پر حیدر علی کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، بایں ہمہ اس کی اور اس کے بیٹوں کی فوجیں کرناٹک پر چھائی ہوئی تھیں اور اسی زمانے میں فرانسیسی بیڑا اور تھوڑی سی بری فوج بھی والی میسور کی مدد کے لیے آ پہنچی تھی جس سے حیدر علی کو بڑی تقویت پہنچی اور اگرچہ حالات جنگ کی روایتوں میں بہت سے اختلافات ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ امر مسلم ہے کہ اس دو تین سال ہی کے اندر مدراس میں انگریزوں کی سلامتی مخدوش نظر آنے لگی اور اگر حیدر علی کے دوسرے اتحادی، جنھوں نے اسے جنگ پر آمادہ کیا تھا خود انگریزوں کے ساتھ صلح نہ کر لیں تو انکا حیدر علی کے مقابلے میں ٹھیرنا دشوار ہو جاتا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اول نواب نظام الملک اور ناگپور کا مرہٹہ رئیس جنگ سے علیحدہ ہو گئے اور اس کے بعد سالبائی کے عہد نامے نے انگریزوں کو مرہٹوں کی طرف سے بھی بالکل مطمئن کر دیا اور ان کی ایک فوج بمبئی کی جانب سے میسور کے مغربی علاقوں پر حملہ آور ہوئی ؛ (۱۷۸۲ء)

اپنے ساتھیوں کی اس طرح علیحدگی پر بھی، حیدر علی کی غیرت و شجاعت نے انگریزوں سے صلح کرنی گوارا نہ کی اور وہ اسی زور و شور سے تنہا لڑتا رہا۔ اس کے زبردست حملوں نے انگریزوں کو جس قدر پریشان و ہراساں کر دیا تھا اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انہی دنوں جب حیدر علی نے وفات پائی (۱۷۸۲ء ۱۱۹۶ھ) تو مدراس میں علانیہ خوشیاں منائی گئیں اور اب بھی انگریز مورخ اس واقعے کو اپنی قوم کی بہت بڑی خوش قسمتی بتاتے ہیں[۱] ؛

---

[۱] مثلاً دیکھو آکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۵۳۵

لیکن حیدر علی کی وفات سے اہل میسور کی جرأت و قوت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کا جانشین فتح علی عرف ٹیپو سلطان انگریزوں سے عداوت اور ذاتی دلیری میں اپنے نامور باپ سے بھی بڑھا چڑھا نکلا۔ وہ باپ کی زندگی میں اپنی سپہ سالاری کے جوہر دکھا چکا تھا اور تنجور کے قریب ایک بڑی لڑائی میں اُس نے نمایاں فتح حاصل کی تھی۔ حیدر علی کی علالت اور وفات کے قریب وہ اپنے مغربی اضلاع میں تھا کہ اس طرف سے انگریزی فوج نے جنرل میتھیو کی سپہ سالاری میں جو حملہ کیا تھا، اس کا سدّباب کرے۔ یہیں اس کو باپ کی وفات کی اطلاع ملی جسے دیوان پورنیا اور کرشنا راؤ نے نئے سلطان کے لشکر گاہ میں پہنچنے تک از رہِ خیر خواہی مخفی رکھا۔ پھر اعلان تخت نشینی ہونے کے بعد وہ دوبارہ جنرل میتھیو کے مقابلے میں بڑھا اور انگریزی لشکر کو اس خوبی سے گھیر کر شکست فاش دی کہ حملہ آوروں میں سے بہ مشکل کوئی بچ کر بھاگ سکا ہوگا ورنہ سب کے سب ہلاک یا قید ہوگئے۔ (جنگ حیدر نگر ۱۷۸۳ء[1]) انگریزی فوج کا ایک حصہ منگلور کی حفاظت کے واسطے متعین تھا، اُسے بھی ٹیپو سلطان نے بڑھکر قلعے میں محصور کر لیا۔

صلح نامہ منگلور

میتھیو کی ہزیمت کامل اور گرفتاری نے انگریزی حکومت کو بہت مایوس کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مرہٹوں سے صلح ہونے کے بعد وہ بہت بڑی فوج میسور کے خلاف جمع کر سکتے تھے بلکہ ونسنٹ اسمتھ کا بیان ہے کہ خود مرہٹوں کو انھوں نے اپنی کمک کے لیے آمادہ کر لیا تھا[2] حالانکہ حکومت میسور نے اس جنگ میں مرہٹوں ہی کی تحریک سے شرکت کی تھی! بایں ہمہ "شیر میسور" کو قابو میں لانا کچھ آسان بات نہ تھی اور ان دکن کی لڑائیوں نے کمپنی کا خزانہ اس قدر خالی کر دیا تھا کہ ولایت سے برابر جنگ ختم کرنے کے تقاضے ہو رہے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے انہی مصارف کے لیے بنارس کے راجہ اور بیگمات اودھ سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کی جو کوشش کی اس میں بھی اتنی کامیابی نہ ہوئی کہ کمپنی کا اچھی طرح کام چل جاتا۔ لہذا

---

[1] اکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۵۲۶۔

[2] ان واقعات کو ہم اپنی پہلی تاریخ ہند (برائے میٹرک) صفحات ۲۰۵ وغیرہ میں کافی وضاحت سے بیان کر چکے ہیں یہاں زیادہ تفصیل سے لکھنا ناموزوں ہوگا۔

مدراس کے انگریزی حکّام نے سلطان میسور سے خود صلح کی درخواست کی اور ان شرائط پر کہ فریقین مفتوحہ مقامات اور جنگ کے قیدیوں کو چھوڑ دیں گے، [۵] میسور کی یہ دوسری جنگ ختم ہوگئی ۔ (مارچ ۱۷۸۴ء مطابق ۱۱۹۸ھ)

۳ - کارنوالس اور جان شور

ہیسٹنگز کا استعفا

مذکورۂ بالا لڑائیوں کے فوائد و اغراض کو نظمائے کمپنی خوب سمجھتے تھے لیکن حکومت انگلستان اس قسم کی کوشش ملک گیری کے موافق نہ تھی اور پارلیمنٹ میں بھی بعض مشہور و ذی اثر مقرر وارن ہیسٹنگز کے خلاف شرر افشانی کرتے رہتے تھے اس مخالفت کا ہندوستان میں یہ اثر ظاہر ہوا کہ ماتحت حکّام وارن ہیسٹنگز کا حکم ماننے میں تساہل و سرکشی کرنے لگے۔ آخر اس کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ ۱۷۸۵ء کے آغاز (۱۱۹۹ھ) میں اپنے عہدے سے استعفا دے کر ولایت چلا گیا ۔

کلکتہ کونسل کے بعض اراکین اور نند کمار کے ساتھ وارن ہیسٹنگز کے جو مناقشے اور لڑائیاں ہندوستان میں ہوئیں، ان کی تفصیل ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہے۔ ان مخالف اراکین میں (جنھوں نے کثرت تعداد کے زور سے کئی سال تک ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی کو معطّل بنائے رکھا) فلپ فرانسس سب سے پیش پیش تھا۔ اسی نے کلکتے کی عدالت میں ہیسٹنگز پر خیانت و رشوت ستانی کا مقدمہ چلایا اور ایک دولتمند برہمن، مہاراجہ نند کمار سے ان الزامات کے ثبوت فراہم کرائے لیکن اوّل تو ہیسٹنگز نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا دوسرے اسی زمانے میں نند کمار پر جعلسازی کا مقدمہ قائم ہوا اور اسے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ غرض ہندوستان میں تو یہ فساد رفع دفع ہوگیا مگر ولایت پہنچ کر فرانسس نے برک اور پٹ جیسے جادو بیان مشاہیر کو ہیسٹنگز کا دشمن بنا دیا اور انہی کی تقریروں کا اثر تھا کہ استعفا دینے کے اجد بھی ہیسٹنگز پر انگلستان میں مقدمہ قائم ہوا اور "دارالامرا"

---

[۵] اس صلح کو اکثر انگریز مورّخ اپنی قوم کے حق میں "باعث ننگ و عار" بتاتے ہیں (مثلاً دیکھو اوکس، ص ۷۶ ۵ "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان" صفحہ ۹۴ وغیرہ) حالانکہ شرائط صلح میں کوئی بات ایسی قابل عار نہیں نظر آتی۔ البتہ عجب نہیں کہ اس موقع پر سلطان میسور کا فاتحانہ طرز عمل نیز انگریز قیدیوں کی تذلیل انگریزوں کو ناگوار ہوئی ہو اور آئندہ میسور بلکہ تمام ہند پر تسلط پانے کے بعد انھیں اپنی گزشتہ ناکامیاں قابل عار نظر آنے لگی ہوں ۔

میں سات برس تک اس کی سماعت و تحقیقات ہوتی رہی۔ آخر وہ تمام سنگین الزامات سے بری قرار دیا گیا اور اس کی باقی عمر (۱۸۱۸ء تک) اطمینان کے ساتھ بسر ہوئی اور اُس نے آیندہ سیاسیات میں حصّہ لینا چھوڑ دیا ؛

قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء

وارن ہیسٹنگز کے طرزِ عمل سے حکومتِ انگلستان کی ناخوشی کا ایک بدیہی ثبوت وہ "قانونِ ہندوستان" تھا جس کی تجویز کو اس زمانے کے وزیرِ اعظم پٹ کے نام سے (پٹس انڈیا ایکٹ) موسوم کرتے ہیں۔ یہ ۱۷۸۴ء (۱۱۹۸ھ) میں نافذ ہوا اور اگرچہ اُس نے کمپنی کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن ایک نئی مجلس نظارت (بورڈ آف کنٹرول) کے قیام سے کمپنی کے معاملات پر حکومتِ انگلستان کی نگرانی بڑھا دی کیونکہ اس مجلس کو کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے ملکی و مالی، جنگی و عدالتی ہر قسم کے معاملات میں دخل دینے کا وسیع اختیار دیا گیا تھا اور اُس کے احکام نظمائے کمپنی کی ایک مخصوص جماعت کے ذریعے نافذ اور واجب التعمیل قرار دیئے گئے تھے۔ نظما کی یہ جماعت "مجلس رازہ" (کمیٹی اوف سیکرسی) کہلاتی تھی۔ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی مجلس نظارت کا صدر نشین بعد میں وزیرِ ہند کے نام سے وزارتِ انگلستان کا رکن بنا لیا گیا اور اس کی کونسل میں ایک "مجلس رازہ" اب تک سابقہ نظام کی یادگار ہے ؛

نئے قانون نے انگریزی عدالت اور گورنر جنرل کے انتظامی اختیارات کے متعلق بھی بعض مفید اصلاحیں کیں اور مدراس و بمبئی کے حکام پر اس کی نگرانی کو بڑھا دیا نیز خاص خاص صورتوں میں گورنر جنرل کو اختیار دیا کہ وہ کونسل کے منشاء کے بغیر اپنی ذمہ داری پر کام کر سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جنگ و صلح کے اختیارات محدود اور اس بات کی صراحت کر دی گئی کہ کمپنی کے ماتحت حکام مجلس نظارت یا مجلس نظماء کی صریح اجازت کے بغیر ہندوستان میں کسی ریاست کے خلاف یا موافق کوئی جنگ نہ کر سکیں گے اور نہ اس قسم کے معاہدے کریں گے جن کی رُو سے کمپنی کو شریکِ جنگ ہونا پڑے، اسی ضمن میں ملک گیری اور کشور کشائی کی ممانعت اور مخالفت پر بھی بہت زور دیا گیا چنانچہ اس قسم کی کوشش بلکہ خواہش کو یہ قانون ان واضح الفاظ میں روکتا ہے کہ

"ہندوستان میں فتوحات اور اضافۂ مقبوضات کے منصوبوں پر عمل کرنا ایسے "کام ہیں جو اس قوم (یعنی اہلِ انگلستان) کی خواہش، راستبازی اور سیاسی

"اصول عمل کے سراسر منافی ہیں!" (اوکس ہس صفحہ ۵۵۲)

لارڈ کارنوالس

یوں بھی نئے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو ہندوستان آتے وقت مذکورۂ بالا اصول پر عمل کرنے کی تاکید کر دی گئی تھی اور وہ خود "عدم مداخلت" کا بڑا حامی سمجھا جاتا تھا لیکن حق یہ ہے کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ میدانِ کارزار میں گزرا تھا اور اگرچہ امریکہ میں آخری شکست اور قبولِ اطاعت[۱] کی وجہ سے اُس کے سپاہیانہ جذبات دھیمے پڑ گئے تھے مگر چند سال آرام لینے کے بعد اُسے ہندوستان میں پھر سیاسی ریشہ دوانی اور فتوحات کا شوق چرّایا تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی کیونکہ درحقیقت خود اہل ہند کی اندرونی حالت اور نااتفاقی اس امر کی متقضی تھی کہ ایک بیرونی قوت انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے۔

الغرض سنہ ۱۱۹۶ فصلی کے اواخر (۱۷۸۶ء) میں[۲] لارڈ کارنوالس ہندوستان پہنچ گیا اور نظم و نسق کے قابو میں آنے اور گویا کچھ عرصہ دم لینے کے بعد اس نے بھی اسی قسم کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں جنہیں محولہ بالا قانون میں اس شد و مد سے روکا گیا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ سلطانِ میسور کو انگریزوں سے غالباً طبعی منافرت تھی لیکن عہد نامۂ منگلور کے بعد سے اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا تھا کہ انگریزوں کو شکایت کا موقع ملتا۔ لہٰذا جب خود لارڈ کارنوالس نے نواب نظام الملک اور مرہٹوں کے ساتھ میسور کے خلاف در پردہ یہ قرارداد کر لی (۱۷۸۸ء) کہ میسور کے شمالی اضلاع پر قبضہ کرنے میں انگریز نواب موصوف کی مدد کریں گے تو یہ صلح نامۂ منگلور کی صریح خلاف ورزی تھی[۳] اس پر بھی ٹیپو سلطان غضب ناک ہو کر خاموش ہو رہا اور خود نواب نظام الملک کی طرف سے بھی لڑائی کی ابتدا نہیں ہوئی لیکن جب اسی زمانے میں ٹراونکور کے راجہ نے میسور کی سرحد پر

سلہ امریکہ کی "جنگ استحصال آزادی" میں سب سے آخر میں جس انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اُس کا سپہ سالار کارنوالس ہی تھا (۱۷۸۱ء) اور اہل انگلستان کی یہی وہ شکست تھی جس نے لڑائی کا خاتمہ کر دیا اور اہل امریکہ آزاد ہو گئے۔

سلہ کارنوالس کے آنے سے قبل تقریباً دو سال تک سر جان میک فرسن عارضی طور پر گورنر جنرل رہا، جس کی "دنائت" اور "بد دیانتی" کی اکثر انگریز مؤرخوں اور خود کارنوالس نے سخت مذمت کی ہے (اوکس ہس صفحہ ۵۵۳ وغیرہ)

سلہ ۵۳ اس در پردہ ساز باز پر انگریز مورخوں نے کارنوالس کی بہت تعریف کی ہے واضح رہے کہ قانون ۱۷۸۴ء کی رو سے وہ باضابطہ کوئی معاہدہ نواب نظام الملک کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے مذکورۂ بالا قرارداد ایک خط کے ذریعے سے کی اور یہی وہ کارروائی تھی جسے گرانٹ ڈف "علانیہ معاہدۂ جنگ کرنے سے بھی زیادہ قابل اعتراض" بتاتا ہے [illegible] ۲۳ ملز [illegible] ۵۵۹

جنگی استحکامات بنوائے اور ولندیزوں نے دو قلعے خرید لئے جو حکومت میسور کے زیر اثر علاقے میں تھے تو سلطان میسور نے راجہ کو تنبیہ کی اور بعض باغی مجرمین کو حوالہ کر دینے کا مطالبہ کیا جو میسور کے علاقے سے بھاگ کر ٹراونکور میں جا چھپے تھے۔ راجہ نے ان مراسلات کی کوئی پروانہ کی اور سلطان میسور نے بگڑ کر اس پر فوج کشی کی اور اس کا مشرقی علاقہ تاراج و پامال کر ڈالا۔ ^[۵۱]^ (۹۰-۱۷۸۹ء مطابق ۱۲۰۴-۱۲۰۳ھ)

تیسری جنگ میسور

ٹراونکور کا راجہ انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس پر حملے کا ہونا کارنوالس کے لئے اعلان جنگ کرنے کا معقول عذر بن گیا وہ جنوبی ہند کی اس آزاد اور خطرناک ریاست (میسور) کو کمزور و پامال کرنے پر پہلے سے تلا بیٹھا تھا۔ اب اس بات کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ نواب نظام الملک یا مرہٹوں کو سامنے رکھکر میسور سے پس پردہ جنگ کی جائے۔ دکن کی یہ دونوں حکومتیں سلطان میسور سے ناخوش ضرور تھیں۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر اس کا ملک فتح اور آپس میں تقسیم کر لینا بھی چاہتی تھیں لیکن کارنوالس کی مذکورۂ بالا تحریک اور ہمت افزائی کے باوجود انھوں نے ابھی تک میسور پر حملہ نہیں کیا تھا اور خود ٹیپو سلطان اس بات پر بھی آمادہ تھا کہ ٹراونکور کے متعلق انگریزوں سے مصالحانہ گفتگو اور اپنے حملے کی وجوہ بیان کرے مگر اسکی یہ درخواست مسترد کر دی گئی ^[۵۲]^ اور فروری ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ) میں جنگ کا اعلان ہوگیا۔

جنگ کے واقعات بیان کرنے میں انگریزی مورخوں نے صریح طرفداری سے کام لیا ہے اور شوکت نمائی کے لیئے زیادہ تر انگریزی فتوحات ہی کا حال تحریر کیا ہے لیکن انہی یک طرفہ روایتوں سے یہ امر ثابت ہے کہ پہلی مرتبہ جو فوجیں جنرل میڈوز کی ماتحتی میں بڑھائی گئی تھیں اور بنگلور و سری رنگ پٹن تک پہنچ گئی تھیں، انھیں جابجا شکستیں ہوئیں اور ہر طرف سے پسپا ہونا پڑا ^[۵۳]^ حتیٰ کہ سال کے ختم پر خود لارڈ کارنوالس میدان میں پہنچ گیا اور مزید سازو سامان کی فراہمی کے ساتھ اُس نے نواب نظام الملک اور مرہٹوں کو تاکید بلیغ کی کہ جلد سے جلد

سنہ ۵۱ ٹراونکور سے لڑائی کے مذکورۂ بالا اسباب کے لیئے دیکھو "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، باب ہفتم۔ مگر اس انگریز مولف نے ان حالات کو ایسے مخالفانہ پیرائے میں لکھا ہے کہ تمام الزام ٹیپو سلطان پر وارد ہو۔

سنہ ۵۲ حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، ۱۴۶

سنہ ۵۳ "حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان"، باب ہشتم

اپنی پوری طاقت سے جنگ میں شریک ہوں۔ چنانچہ صرف مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد جو پرشرام بھاؤ اور ہری پنت پھڑکے کے ماتحت میسور پر حملہ آور ہوئی کم سے کم بیس ہزار تھی۔[1] حیدرآباد کی فوج کا شمار اس سے بھی زیادہ تھا اور بے شبہ ریاست میسور کی یہ بساط نہ تھی کہ اس عظیم الشان لشکر کا مقابلہ کرتی جو تین طرف سے ملک پر حملہ آور ہوا تھا لیکن ٹیپو سلطان اپنی شجاعت کی بدولت انگریزوں میں نیم دیوانہ سمجھا جاتا ہے اور اپنے ہم وطنوں میں "شیر میسور" کے لقب سے ملقب تھا۔ ان کثیر التعداد حملہ آوروں کا جو درحقیقت میسور کی آزاد حکومت و قوت کے دشمن تھے۔ اُس نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا اور اس کے بہادر سپاہیوں اور سرداروں نے اتحادیوں کی ہمتیں پست کر دیں خود کارنوالس کو سری رنگا پٹن پہنچ کر پہلی مرتبہ خائف و ناکام پسپا بلکہ فرار ہونا پڑا[2] اور آخر میں جب اتحادیوں نے پوری طاقت اُس شہر کے گرد جمع کر لی، اس وقت بھی وہ "شیر میسور" کے پائے تخت کو تسخیر نہ کر سکے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔

عہد نامہ سری رنگا پٹن

صلح کی جو شرطیں قرار پائی تھیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فتح میں انگریز شریک غالب نہ تھے چنانچہ تنگ بھدرا ندی کے شمال کے تمام اضلاع نواب نظام الملک اور مرہٹوں کے حصے میں آئے جو بہت دن سے ان پر دعویٰ ملکیت رکھتے تھے ملیبار کا ساحلی حصہ اور مشرق میں ڈنڈگل اور بارہ محل کے باموقع جنگی مقام انگریزوں کو ملے اور تاوان جنگ (تین کروڑ تیس لاکھ روپیہ) اتحادیوں میں بحصہ مساوی تقسیم کر لیا گیا لیکن جب والیِ میسور نے یہ شرطیں مان لیں اور اپنے دو بیٹے بطور یرغمال نیز کچھ روپیہ پیشگی محاصرین کے حوالے کر دیا تو کارنوالس نے عہد نامے میں ایک نئی شرط یہ بڑھا دی کہ کورگ بھی ریاست میسور سے لے کر انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا! کارنوالس کی اس حرکت نے ٹیپو سلطان کو سخت برافروختہ کیا لیکن اس کے بیٹے دشمن کے لشکر میں پہنچ چکے تھے غم و غصہ کھا کر خاموش ہو گیا اور معاہدے پر دستخط کر دیئے۔[3]

---

[1] حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۵۹ مگر یہ کم سے کم اندازا غالباً غلط تخمینہ ہے۔ گرانٹ ڈف کی الجھی ہوئی تحریر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی (تاریخ مرہٹہ" جلد سوم باب سوم)

[2] دیکھو تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۵۶ اوکس ص ۶۰ و ۵۹ ۔ کین جلد اوّل صفحہ ۲۲۷ -

[3] اوکس ص صفحہ ۶۰ و حیدر علی ۔ سلطان" ۱۷۱ وغیرہ، ونسنٹ اسمتھ نے بھی اس ناجائز کارروائی کو ایک حد تک قابل اعتراض سمجھا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ لارڈ کارنوالس کا جو کمپنی کے پہلے ملازمین کی طرح بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ

(۱۷۹۲ء مطابق ۱۲۰۶ھ)

ملکی اصلاحات

اس فتح کے بعد، جس کے صلے میں کارنوالس کو "مارکوئیس" بنایا گیا تھا، اس کا باقی وقت نظم ونسق کی اندرونی اصلاح میں صرف ہوا۔ اس نے عدالتوں کی از سر نو تنظیم اور ان کے اختیارات کی حد بندی کی۔ وہ ہندوستانیوں کی نسبت بہت بری رائے رکھتا تھا اور ان کے ہاتھ سے تمام فوجداری اختیارات لے لینے چاہتا تھا۔ اس نے تنخواہوں میں بھی جو جدید اضافے کیئے ان سے ہندوستانی ملازمین کو محروم کر دیا[۹۳]۔ بایں ہمہ اس کے زمانے کا یہ کارنامہ یادگار ہے کہ بنگالے میں "دوامی بندوبست" جاری کیا جس نے اس صوبے کی گذشتہ پامالی کی بہت کچھ تلافی کر دی[۹۴]۔

اس بندوبست کی رو سے زرعی زمین پر ہمیشہ کے لیئے سرکاری لگان کی ایک رقم معین کر دی گئی جس سے مالکانِ زمین کو زراعت میں ترقی دینے کی ترغیب وتحریص ہوئی اور ان کے صرفِ کثیر اور کوشش سے بہت سی افتادہ زمینیں مزروعہ ہو گئیں۔ ابتدا میں یہ کسر ضرور تھی کہ قانون میں مالکانِ زمین کی کاشتکاروں سے زیادہ ستانی کا کوئی تدارک نہیں کیا گیا تھا اور یہ نقص کچھ عرصے بعد دفع ہوا لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں "دوامی بندوبست" ملکی خوش حالی کی ضمانت ہے اور اس پر جو انگریز مصنف یا اہل الرائے اعتراض کرتے ہیں وہ ان کی نافہمی یا بے انصافی ہے۔ ہندوستان کے مشہور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲ بے اصول آدمی نہ تھا، ایسی حرکت کرنا بالکل خلافِ توقع تھا۔ اسی ضمن میں یہ جتانا مناسب ہوگا کہ بعض انگریزی مصنفوں نے شرائط صلح کو بہت نرم بتایا اور کارنوالس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے ایسے دشمنِ سخت کو مغلوب کرنے کے بعد پھر سلامت کیوں رہنے دیا۔ لیکن دراصل ان معترضین کو یہ غلط فہمی خود اپنی غلط بیانیوں سے پیدا ہوئی ہے اور اگر وہ انگریزی فتوحات کو اس قدر بڑھا چڑھا کر نہ لکھیں اور واقعات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شرائط صلح عین مناسب تھیں۔ دوسرے کارنوالس چاہتا بھی تو اپنے اتحادیوں کی رائے کے بغیر میسور کو بالکل فنا نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ اتحادی خاص کر مرہٹے زیادہ سخت شرائط کے خلاف تھے۔

۹۳ اوکس ہس صفحہ ۱۷۵

۹۴ واضح رہے کہ گورنر جنرل کو اس وقت تک مدراس وبمبئی کے مقامی انتظامات میں زیادہ دخل نہ تھا اور بنگالے کی طرح کوئی بڑا صوبہ بھی براہ راست انگریزوں کے قبضے میں نہ آیا تھا۔

محبّانِ وطن کی سالہاسال سے یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے صوبوں کا بھی اسی طرح دوامی بندوبست کر دیا جائے جو رعایا کی آسودگی کی نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس مسئلے پر مفصّل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں مگر معترضین کے شبہات کی تردید میں مختصر طور پر یہ جتانا نامناسب نہ ہوگا کہ بنگالے کے لوگ آج ہندوستان کے دوسرے صوبے والوں سے زیادہ دولتمند و آسودہ حال ہیں۔ اسی آسودہ حالی کی بدولت وہاں تعلیم و تمدّن اور آبادی میں جو ترقّی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اور غالباً اس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ انکی یہ فلاح و خوش حالی بیشتر دوامی بندوبست کے طفیل ہے جس سے ہندوستان کے دوسرے صوبے اب تک محروم ہیں ؎

سر جان شور

اگست ۱۷۹۳ء (۱۲۰۸ھ) میں کارنوالس کے عہدے کی میعاد ختم ہوئی اور اس کی سفارش پر سر جان شور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ دنسنٹ اسمتھ سر جان شور کے ذاتی اوصاف اور خصائل نیک کا معترف ہے لیکن لکھتا ہے کہ ہند کے معدودے چند واقعی ناکارہ گورنر جنرلوں میں جو لوگ بدترین گذرے ہیں اونمیں سے ایک سر جان شور بھی تھا۔ قانونِ ہند مجریہ ۱۷۸۴ء کی تعمیل لفظی اور مرہٹوں کے خوف نے اس کی عقل معطل کر دی تھی۔ وہ ماتحت بنکر کام اچھا کر سکتا تھا لیکن کامل اختیارات پاکر حوصلہ مندی سے کام کرنا اس کا حصّہ نہ تھا۔ چنانچہ نواب نظام الملک سے جو عہدنامہ ہوا تھا اُس میں ایک لفظی بحث نکالکر اُسنے فیصلہ کر لیا کہ کمپنی مدد دینے پر مجبور نہیں ہے درانحالیکہ ریاست حیدرآباد کی طرف سے گنٹور کا علاقہ تفویض ہونے کا مقصد یہی تھا کہ وقت ضرورت کمک پہنچائی جائے گی مگر سر جان شور نے کمپنی کی نیکنامی کا مطلق خیال نہ کیا اور مدد سے انکار کرنے میں ایسی پوچ دلائل پیش کیں جن کا صاف مطلب یہ تھا کہ ایفائے عہد میں کمپنی کا کوئی مالی نفع نہ تھا۔ غرض جس وقت ۱۷۹۵ء (۱۲۰۹ھ) میں مرہٹہ سرداروں نے آخری مرتبہ متحد ہوکر بہت بڑی فوج سے ریاست حیدرآباد پر حملہ کیا تو سر جان شور نے نہایت خودغرضی اور سیاسی بزدلی سے علانیہ عہدشکنی کی اور نواب نظام الملک کو مدد دینے سے انکار کر دیا[۱] ؎

[۱] ونسنٹ اسمتھ صفحہ ۵۴۷۔ مرہٹوں کو اس موقع پر (جنگ کھرڈا میں) جو فتح حاصل ہوئی اس کا ہم پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں ؎

لیکن اس برافروختہ مورخ نے سرجان شور کی کمزوریوں میں قانون کی غلامانہ پابندی کو جو ایک سبب قرار دیا ہے وہ آگے چلکر درست نہیں رہتا کیونکہ دو ہی سال بعد جب نواب آصف الدولہ والی اودھ نے وفات پائی تو اگرچہ انگریزی حکومت نے اوّل اُسکے (سوے پالک) بیٹے نواب وزیر علی کو وارث صحیح تسلیم کر لیا تھا مگر چند ہی مہینے بعد سرجان شور نے "عدم مداخلت" کے اصول کو جسکی پابندی از روئے قانون ضروری تھی بالائے طاق رکھکر نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں سے ایک نیا معاہدہ کر لیا جس کی رُو سے الہ آباد کا مشہور و باموقع قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور فوجی مصارف کے نام سے جو روپیہ ریاست اودھ ادا کرتی تھی اُسے بڑھا کر ۷۶ لاکھ سالانہ کر دیا گیا۔ اسکے عوض میں وزیر علی معزول اور سعادت علی خاں والی اودھ بنا دیئے گئے (۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۱۲ سنہ)

باب چہارم

سیادتِ ہند کا منصوبہ

۱- ولزلی کے ارادے اور کارنامے

نیا گورنر جنرل

رچرڈ ولزلی "لارڈ" کا خطاب پانے سے پہلے "ارل اوف مارننگ ٹن" کے خطاب سے مشہور تھا، اور گورنر جنرل مقرر ہونے سے قبل نظمائے کمپنی کی مجلس نظارت کا رکن رہ چکا تھا۔ اسے ہندوستانی معاملات اور دنیا کے عام سیاسی حالات سے کافی واقفیت تھی اور "لارڈ ڈل ہوزی کی طرح وہ اس بات کا یقین کامل رکھتا تھا کہ ہندوستان کی دیسی حکومت سے انگریزی حکومت افضل ہے۔ اسی یقین کی بنا پر اُسنے ہندوستان میں جدھر ہاتھ پڑا بے دھڑک دیسی رئیسوں کی حکومت سے ملک نکالکر انگریزی حکومت میں شامل کر لئے کیونکہ اس قسم کا ہر الحاق اس کے نزدیک بلاشک وشبہ لوگوں کے حق میں مفید تھا[۱]۔ ولزلی کے دو بھائی بھی اس کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے جن میں سے ایک (آرتھر) ڈیوک اوف ولنگٹن اور دوسرا (ہنری) لارڈ کنوولی کے خطاب سے مشہور ہوا۔ ولزلی کے ماتحت عہدہ داروں میں بھی الفنسٹن، ملکم وغیرہ بعض انگریز آگے چلکر بہت مشہور ہوئے۔ اور حق یہ ہے کہ جیسے پرجوش شائق فتوحات انگریز مدبر ولزلی کے دور میں جمع ہو گئے تھے عرصے تک پھر ہندوستان میں جمع نہ ہوئے ہونگے۔ اس اولوالعزمی اور شوقِ کشور کشائی کا ایک سبب ولزلی کی جوان سالی تھی کہ جب کمپنی کی طرف سے وہ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا (مئی ۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۱۲ھ) تو اس کی عمر چالیس برس کی بھی نہ تھی، دوسرے ملک فرانس کی رقابت اور نپولین بونا پارٹ کے ساتھ کشمکش نے بھی اس زمانے کے انگریزوں میں تازہ جوش پیدا کر دیا تھا اور جہاں جہاں ممکن تھا وہ اپنے استحکام قوت کی

---

[۱] او کس ہس صفحہ ۵۸۰۔

دھن میں لگے ہوئے تھے۔

معاملات دکن

ہندوستان کے انگریز حکام کو سب سے زیادہ کد سلطان میسور کے ساتھ تھی۔ اور وہ بھی اپنی جگہ برابر اُن کے خلاف سازباز کرتا رہتا تھا اُسے اپنے ہم وطن ہمسائیوں سے بھی نہایت بدگمانی اور خصومت تھی، اور اس بات سے ناامید ہو چکا تھا کہ یہ ہمسائے انگریزوں کی نوخیز قوت کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔ دراصل پونا کے مرہٹہ سردار تو باہمی نفاق و خودغرضی کے مرض میں ایسے گرفتار تھے کہ کھروا کی فتح سے جو بیش قیمت علاقے انھوں نے حاصل کیئے تھے، تین چار سال کے اندر ان کا بیشتر حصہ ہاتھ سے نکل گیا اور حکومت پونا کوئی تدارک نہ کر سکی لیکن حیدرآباد کے اہل الرائے کو "نودولت"، حیدرعلی اور اس کے جانشین کے ساتھ ابتدا سے اختلاف تھا۔ اور گذشتہ جنگ میسور نے بھی اس اختلاف کو بڑھا دیا۔ لہٰذا ٹیپو سلطان جیسے خوددار اور خودسر فرمانروا کو حیدرآباد کی طرف سے کسی بھلائی کی آرزو تھی نہ امید۔ اسی کے ساتھ وہ خوب جانتا تھا کہ ایسے قوی دشمنوں میں ریاست میسور کی سلامتی دشوار ہے۔ خود اس کا ملک اسقدر چھوٹا تھا کہ وہ تنہا اپنی قوت سے متحدہ ہمسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ گذشتہ جنگ کے نقصانات کی تلافی ہی میں اس کے کئی سال صرف ہو گئے تھے۔ ایک صورت اپنے بچانے کی یہ تھی کہ انگریزوں سے، جن شرائط پر ممکن ہو مصالحت کر لی جائے۔ مگر انگریزوں کے سامنے جھکنا سلطان میسور کو کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ دوسرے کرناٹک اور بنگالے کی نظیریں اس کے سامنے تھیں جہاں انگریزوں کے دوستانہ رسوخ نے رفتہ رفتہ تسلط حاکمانہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

الغرض، ٹیپو سلطان کی حفاظتِ خوداختیاری کی کوشش اب ایک مایوسانہ جدوجہد بن گئی تھی کہ کبھی تو وہ مرہٹوں کو انگریزوں سے توڑنے کی سعی کرتا کبھی ریاستِ حیدرآباد کی بیرونی اور اندرونی لڑائیوں میں سازباز کرتا اور کبھی اپنے ایلچی کابل بھیجتا کہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زماں شاہ کو ہندوستان فتح کرنے کی ترغیب دے لیکن معلوم ہوتا ہے اگر اُسے واقعی کسی بیرونی قوم سے مدد کی امید پیدا ہوئی تو وہ فرانسیسی تھے جن کی انگریزوں کے ساتھ مدت سے قومی جنگ ٹھنی ہوئی تھی۔

فرانسیسیوں کا معاملاتِ ہند میں

ہندوستان میں اہلِ فرانس کی جنگی قوت کے ٹوٹنے کا حال گذشتہ اوراق میں

ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور پانڈی چیری کی آخری تسخیر (۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۴ھ) کے بعد سے وہ ہندوستان میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ کر سکے تھے جو ان کی جنگی اور سیاسی قوت کا مرکز بن جاتا۔ تاہم اس قوم کے اکثر افراد ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود تھے اور بعض نے دیسی ریاستوں کی ملازمت میں کافی رسوخ حاصل کر لیا تھا آتشی اسلحہ کی ساخت اور استعمال میں اُن کی ہنرمندی صدیوں سے ہندوستان میں مشہور تھی۔ لیکن بارہویں صدی ہجری میں قومی انحطاط نے اہل ہند کو سپاہیانہ فنون میں بھی پسماندہ کر دیا تھا اور اس عہد میں ریمون، ڈبوئنی، پیراں، لااسمر وغیرہ فرنگی سپہ سالاروں کے نام آوری پانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خود اہل ہند میں جنگی انتظام اور سپہ سالاری کی قابلیت فوت ہوتی جاتی تھی۔

ریاستِ میسور میں ایسے کسی فرنگی سپاہی کو شہرت حاصل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ خود حیدر علی اور اس کے بیٹے اعلیٰ درجے کے سپہ سالار اور جنگی انتظامات میں فرنگی سرداروں کی مدد سے مستغنی تھے۔ ورنہ انگریزوں کی رقابت نے حکومتِ میسور کو ابتدا سے اہلِ فرانس کا دوست بنا دیا تھا اور بالخصوص ٹیپو سلطان کے عہدِ حکومت میں میسور کا پائے تخت بہت سے آوارہ گرد فرانسیسیوں کا مستقر بن گیا تھا۔ جہاں انھوں نے انقلابِ فرانس کی یادگار میں جمہوریت پسندوں کی ایک باقاعدہ انجمن بنائی (۱۷۹۷ء) اور خود سلطانِ میسور کا نام فرانس کے آزاد "شہریوں" میں درج کر لیا تھا۔

اندرونی استحکام اور جنگی تیاریوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کی یہ سب کوششیں دراصل دفاعی نوعیت رکھتی تھیں بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ اگر وہ انگریزوں کی بیخ کنی کے درپے تھا تو اس کی بڑی وجہ بھی اب یہ رہ گئی تھی کہ ان کی قوت پذیری میں خود اسے اپنی ریاست کے لالے پڑے تھے۔ ورنہ اُسے فرانسیسیوں سے اگر کسی بڑی امداد یا ہند پر حملے کی امید تھی بھی تو تھوڑے ہی دن بعد نپولین کی مصر و شام میں ناکامی (۱۷۹۹ء) نے اسے باطل کر دیا۔ البتہ سلطانِ میسور کی اہلِ فرانس کے ساتھ دوستی، انگریزوں کے خلاف جنگی اتحاد کے منصوبے اور نپولین یا جزیرۂ موریشس کے فرانسیسی گورنر سے خط کتابت انگریزوں کو اشتعال دلانے کے کافی اسباب تھے۔ نئے گورنر جنرل کے دل میں شوق کشور کشائی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مدراس کے انگریز حکام نے ہر چند

میسور کی آزادی کا خاتمہ

لیسٹ ویل کی[1] ولزلی نے ایک نہ سنی اور سلطانِ میسور کیساتھ جنگ کرنیکا فیصلہ کرلیا۔

اسے تقدیر کی یاوری سمجھنا چاہئیے کہ ولزلی کے عزمِ مصمم کو ایک غیر متوقع واقعے سے بڑی تقویت پہنچ گئی۔ وہ یہ کہ اسی زمانے میں حیدرآباد کے فرانسیسی سپہ سالار موسیو ریمون نے وفات پائی۔ اور وہ جرار سپاہ جسے فرانسیسیوں کی سعی و قابلیت نے ہندوستان کی بہترین فوج بنادیا تھا۔ سیاسی تدبیروں سے بالآخر خشہ انگریزوں کے قابو میں آگئی اور اسے ہتیار لے کے برطرف کردیا گیا۔ اس واقعے کا ہم اس کتاب کے پہلے باب میں ذکر کرچکے ہیں۔ یہاں دہرانے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ اس طرح بغیر لڑے بھڑے ریاست حیدرآباد کے بےبس رہ جانے سے جہاں یہ ریاست انگریزوں کے زیرِ اثر آگئی وہیں فتح میسور میں بھی آسانیاں پیدا ہوگئیں کیونکہ گو حکومت حیدرآباد کی ٹیپو سلطان سے مخالفت تھی لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ انگریزوں کا میسور پر قابض ہوجانا پسند نہ کرے گی اور اگر ٹیپو سلطان کو مدد نہ دے تو بھی کم سے کم اپنے فرانسیسی سرداروں کے اثر سے جنگِ میسور میں کوئی حصّہ نہ لے گی۔ مگر یہ سب قیاس غلط ثابت ہوئے۔ مذکورۂ بالا واقعے نے صورتِ حالات کو بالکل بدل دیا۔ اور اب حیدرآباد کی فوج انگریزوں کے حلیف کی حیثیت سے میسوری علاقوں پر حملہ آور ہوئی۔

میسور کی اس چوتھی اور آخری جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا۔ بلکہ تین چار مہینے کے اندر ختم ہوگئی (۱۷۹۹ء مطابق ۱۲۱۳ھ) شروع سے اتحادیوں نے بڑے سازوسامان اور اہتمام کے ساتھ تین طرف سے نرغہ کیا تھا۔ اور ان کی زبردست فوجوں نے کامیابی سے اسے بڑھکر سری رنگ پٹن کا محاصرہ کرلیا۔ آغازِ جنگ سے محاصرے کے وقت تک سلطانِ میسور نے کئی بار صلح کی سلسلہ جنبانی کی لیکن ولزلی اس کی آزادی کا خاتمہ کرنے کا پختہ ارادہ کرچکا تھا اور "شیرِ میسور" کو انگریزوں کی محکومانہ اطاعت کسی حال میں گوارا نہ تھی۔ وہ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی موت اور سری رنگ پٹن کی تسخیر کے ساتھ تمام ریاست فتحمندوں کے ہاتھ میں آگئی۔ میسور کا تقریباً نصف علاقہ وہاں کے

[1] مدراس کے گورنر نے اول تو جنگ کے جھگڑوں میں پڑنے کو احتیاط کے خلاف بتایا دوسرے غالباً کئی بار ولزلی کو یاد دلایا تھا کہ میسور پر فوج کشی کرنا قانون ہندوستان مجریہ ۱۷۸۴ء اور نیز معاہدہ سری رنگ پٹن کے خلاف ہے ("حیدر علی" و "ٹیپو سلطان" صفحات ۱۸۲ وغیرہ)

قدیم راجاؤں کے خاندان کے نام واگذاشت کر دیا گیا تھا لیکن وہ بھی عرصۂ دراز تک انگریزی رزیڈنٹ کے اختیار و نگرانی میں رہا۔ باقی نصف میں سے چند اضلاع ریاست حیدر آباد کے حصے میں آئے تھے مگر ولزلی نے سال ڈیڑھ سال بعد ہی فوجی مصارف کے نام سے انھیں واپس لے لیا۔ یہ مصارف اس انگریزی فوج کے تھے جسے نئے معاہدے کی رو سے نواب نظام الملک کو اپنے ملک میں رکھنا ضروری تھا۔

زیر مقبوضات (الحاقی)

میسور کا قبضہ، جنگ و فتح کا ثمرہ تھا لیکن ادھر سے فرصت ملتے ہی ولزلی نے ان ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کیا جو اب تک انگریزوں کی دوست یا "زیر حفاظت" تھیں جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ولزلی جس طرح ممکن ہو انگریزی مقبوضات بڑھانے چاہتا تھا[51] مگر لطیفہ یہ ہے کہ اپنی اس حکمت عملی کو وہ قانون ۱۷۸۴ء کے عین مطابق بتاتا تھا جس کے یہ الفاظ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ "ہندوستان میں فتوحات اور اضافہ مقبوضات کے منصوبوں پر عمل کرنا . . . اہل انگلستان کی خواہش، راستبازی اور اصول عمل کے سراسر منافی" ہے!

بہر حال، سب سے اول انگریزی حکومت نے تنجور و سورت کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کیا (۱۷۹۹ء) جو مدت سے کمپنی کی دوستدار تھیں۔ پہلی ریاست کی وراثت کے متعلق راجہ کے خاندان والوں میں نزاع تھی۔ انگریزوں نے سمجھا بجھا کر مسند نشین راجہ کو آمادہ کر لیا کہ وہ کمپنی سے وظیفہ لے کر ریاست سے دست بردار ہو جائے[52] انھی دنوں سورت کے نواب نے وفات پائی اور اس کی ریاست کے متعلق بھی "اسی قسم کا انتظام" کر دیا گیا۔ اس الحاق کے دو سال بعد نواب عمدۃ الامرا والی کرناٹک نے وفات پائی۔ (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) اس ملک میں نواب محمد علی ہی کے زمانے سے انگریزوں کا بہت کچھ رسوخ جم گیا تھا اور ایک دو مرتبہ انھوں نے تمام اختیارات بھی (انتظام کیلئے) نواب سے لے لئے تھے۔ بایں ہمہ نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا جس طرح ممکن ہوا اپنا بھرم بنائے رہے اور ان کی بڑی تدبیر یہ تھی کہ مدراس کے انگریز حکام کو رشوتیں اور نذرانے دے دے کر

[51] ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ "ملک گیری کے اصول اور اس یقین واثق نے کہ جو علاقہ براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آئیگا اس کی فلاح و بہتری میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، ولزلی کو آمادہ کر دیا کہ کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کرنیکا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دے"۔ اوکس ہس ص ۵۸۸۔

[52] اوکس ہس ص ۵۸۸۔

اپنا طرفدار کر لیتے تھے لیکن ولزلی پر یہ جادو کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے عمدۃ الامرا کے فرزند علی حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ سالانہ وظیفہ لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ علی حسین میں انگریزوں سے لڑنے کی قوت نہ تھی لیکن اس کی غیرت نے اس قسم کا عہد و پیمان کرنا گوارا نہ کیا اور شاید اس کو یہ بھی امید تھی کہ انگلستان میں کوشش کی جائے گی تو گورنر جنرل کا فیصلہ مسترد ہو جائے گا مگر ولزلی اس کی پیش بندی کر چکا تھا[۱] ادھر نواب محمد علی کا ایک دوسرا پوتا (عظم الدولہ) سالانہ وظیفے پر خطاب نوابی لے کر ریاست چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور ولزلی نے اسی کو عمدۃ الامرا کا جانشین مان کر علاقہ کرناٹک کا الحاق کر لیا۔

یہ جولائی سنہ ۱۸۰۱ئہ (۱۵ ربیع الآخر ۱۲۱۶ھ) کا واقعہ ہے۔ اس سے چند مہینے قبل (جنوری سنہ ۱۸۰۱ئہ) نواب وزیر والی اودھ نے "جو اپنی بے بسی کی وجہ سے کرب کی حالت میں تھا" ایک نئے معاہدے پر مجبوراً دستخط اور تقریباً آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا جس میں گورکھپور، بریلی، فتح پور وغیرہ متعدد زرخیز اضلاع شامل تھے۔ ولزلی کی اس کارروائی کو، ونسنٹ اسمتھ نے بھی جو اس کا بہت مداح اور طرفدار ہے قابل اعتراض اور بڑی زبردستی تسلیم کیا ہے[۲]۔

مرہٹوں سے معاملات

اب نواب نظام الملک کی طرح، والی اودھ بحیثیت ایک ماتحت حلیف کے، اور کرناٹک و میسور بحیثیت ملک مفتوحہ کے حکومت انگریزی کے ہاتھ میں تھے۔ اور ہندوستان بھر میں صرف مرہٹے انگریزوں کے حریف مقابل رہ گئے تھے۔ پنجاب نے ابھی تک آزاد ریاست کی حیثیت یا کوئی قابلِ ذکر قوت حاصل نہیں کی تھی سلاطین مغلیہ کے وارث کو عمر و حکومت کے انحطاط نے بیکار کر دیا تھا۔ لہٰذا ولزلی نے جسے تمام کشور ہند پر انگریزی سیادت قائم کرنے کی دھن بندھی ہوئی تھی، مرہٹوں کی طرف توجہ مبذول کی اور پیشوا باجی راؤ (ثانی) کو انگریزوں کے ساتھ اسی قسم کا معاہدہ ("عہد معاونت"، یا سب سڈئیری الائنس) کرنے پر آمادہ کیا جیسا کہ دو سال پہلے نواب نظام الملک نے

[۱] نواب محمد علی اور عمدۃ الامرا کے چند خطوط ولزلی نے مہیا کیے تھے جن سے ان کی والی میسور کے ساتھ سازباز ظاہر ہوتی تھی لیکن اوّل تو انکی اصلیت ہی مشتبہ تھی (ادکس ص ۵۸۱) دوسرے اگر وہ اصلی تھی تو بھی باپ دادا کے جرم کی علی حسین خاں کو سزا دینی کچھ قرینِ انصاف و درستی نہیں نظر آتی۔ [۲] ادکس ص صفحہ ۵۹۰

کیا تھا اور جس کی رُو سے معاہدہ کرنے والی ریاست کو ایک انگریزی فوج اپنے خرچ سے ملک میں رکھنی پڑتی تھی کہ بوقت ضرورت سرکار انگریزی کو مدد دے۔ نیز اقرار کرنا ہوتا تھا کہ وہ (ریاست) حکومت انگریزی کے مشورے کے بغیر کسی دوسری ریاست سے نہ جنگ کرے گی نہ اتحاد۔ اور نہ انگریزوں کے سوا کسی دوسری فرنگی قوم کے آدمی کو اپنی سرحد میں نوکر رکھے گی۔

یہ شرطیں قبول کرنا گویا انگریزوں کی سیادت یا سیاسی برتری کو تسلیم کر لینا تھا۔ ولزلی کے خیال میں ان سے کم شرائط پر کسی دیسی رئیس کے ساتھ مصالحت رکھنی ممکن نہ تھی اور پیشوا سے اِن شرطوں کے مان لینے پر وہ اس طرح اصرار کرتا تھا کہ گویا اُسے اس امر کا مطلق[1] احساس ہی نہیں کہ وہ درحقیقت پیشوا اور تمام مرہٹہ سرداروں کو اسبات کی صلاح دے رہا ہے کہ اپنی خود مختاری چھوڑ کر انگریزوں کے محکوم محض بن جائیں۔"

یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے کہ ولزلی پیشوا کی کمزوری اور دوسرے مرہٹہ رئیسوں کی قوت و خود مختاری سے بے خبر ہو لیکن سب سے اوّل پیشوا کے ساتھ معاملہ کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ اگر مرہٹہ قوم کا یہ برائے نام سردار قابو میں آگیا تو پھر دوسرے رئیسوں کے معاملات میں دخل دینے کا قانونی جواز پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ گو وہ سب اپنی اپنی جگہ مدت سے خود مختار ہو گئے تھے لیکن رسمی طور پر پونا کی صدر حکومت کے تابع تھے۔ دوسرے یہ کہ مرہٹوں کی چاروں آزاد قوتوں میں پیشوا ہی کی قوت سب سے کمزور نظر آتی تھی اور نانا فرنویس کی وفات (۱۸۰۰ء) کے بعد پونا میں حصول اقتدار کے لیے جو خانہ جنگی بپا ہوئی اُس نے پیشوا کو اور بھی پریشان اور بیرونی امداد کا محتاج بنا دیا تھا۔

باایں ہمہ باجی راؤ اوّل اوّل ولزلی کی مذکورۂ بالا شرطیں ماننے پر تیار نہ تھا اور اُسے امید تھی کہ پونا کے اندرونی جھگڑوں میں خود اس کا فریق کامیاب ہوگا۔ لیکن اسے انگریزوں کے نصیب کی یاوری کہنا چاہیئے کہ مرہٹوں کی اس خانہ جنگی کے سب سے خونریز معرکے میں پیشوا کے دوست دولت راؤ (سندھیا) کو شکست ہوئی اور میدان جسونت راؤ ہلکر کے ہاتھ رہا۔ (جنگ پونا۔ اکتوبر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ) سندھیا کے شکست کھاتے ہی باجی راؤ پونا سے بھاگ گیا تھا۔

[1] اوئس ص ۵۹۶

پھر جسونت راؤ ہلکر نے ہر چند اس کو بلایا اور صلح و آشتی کی تدبیریں کیں، وہ نہ آیا اور یہ واقعہ اُس زمانے کے طبقۂ اعلیٰ کی دماغی اور اخلاقی کیفیت ظاہر کرتا ہے کہ باجی راؤ نے اپنے ہم وطنوں کی دوستی یا زیادہ سے زیادہ محکومی قبول کرنے پر انگریزوں کی محکومی قبول کرنے کو ترجیح دی اور انگریزی امداد کے معاوضے میں ولزلی کی تمام شرطیں تسلیم کرلیں [۱] (عہدنامۂ بسین دسمبر ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ھ)

دوسری جنگ مرہٹہ

اب ایک انگریزی فوج نے باجی راؤ کو ساتھ لے کر پونا پر پیشقدمی کی۔ ہلکر اپنی مذکورۂ بالا کامیابی کے بعد باجی راؤ کے بھائی (امرت راؤ) کو پیشوا بنا گیا تھا لیکن اس نے یعنی (امرت راؤ) نے باجی راؤ کے دوبارہ پونا آنے کی مزاحمت نہ کی اور سالانہ وظیفہ لے کر بنارس چلا گیا۔ باجی راؤ انگریزوں کی مدد سے دوبارہ حکومت پونا پر بحال ہوا اور اس واقعے کی اطلاع کے ساتھ ہی برار کے بھونسلا راجہ اور مالوے کے ہلکر و سندھیا رئیسوں کو ولزلی نے جتا دیا کہ اب اسی قسم کا معاہدہ کئے بغیر، جسے باجی راؤ نے قبول کرلیا ہے، کوئی مرہٹہ رئیس پونا کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ پھر بھونسلا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں کمپنی کے حلیف نواب نظام الملک کی سرحدوں کے قریب سے دور ہٹالے جب اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو ولزلی نے، جو پہلے ہی وسیع پیمانے پر جنگ کے سازوسامان کررہا تھا۔ اعلان جنگ کردیا (اگست ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ)

اس جنگ کے مشہور معرکے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ہوئے اور اوّل اوّل بھونسلا اور سندھیا کے مقابلے میں انگریزوں کو قریب قریب ہر جگہ کامیابی ہوئی لیکن ہلکر نے جو اندرونی نفاق کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کے ساتھ شریک نہ ہوا تھا جاٹوں اور پنڈاروں کی مدد سے اپنا علیحدہ جتھا بنایا اور اگرچہ اس کے تحت میں نہ اس قدر بڑی اور منتظم فوج تھی نہ ایسا عمدہ سازوسامان تھا جیسا کہ انگریزوں یا سندھیا

---

[۱] یعنی انگریزوں کی امداد سے اپنی حکومت پر بحال ہونے کے عوض میں۔ انگریزی فوج کی کم سے کم چھ پلٹنیں اپنے ملک میں رکھنی اور ان کے مصارف (۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ) ادا کرنے قبول کئے۔ سورت اور ہر وہ پر حکومت پونا کو جو دعاوی تھے، سب سے باجی راؤ دست بردار ہوگیا اور "عہد معاونت" کی دیگر شرائط بھی تسلیم کرلیں۔

کے پاس تھا، بایں ہمہ انگریزوں کو سب سے زیادہ دشواری نیز ناکامی اسی کے مقابلے میں پیش آئی اور حق یہ ہے کہ انھی آخری معرکوں نے ولزلی کی فتوحات اور ناموری کو بہت کچھ دھندلا کر دیا اور انگلستان میں نظمائے کمپنی اس سے ناراض ہو گئے

کمپنی کا غلبہ سندھیا اور بھونسلا پر۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ دولت راؤ سندھیا کا مالوے اور نواحِ دلی کے علاقوں پر قبضہ تھا۔ شاہ عالم کو اسی زمانے میں اس نے نجیب آباد کے پٹھانوں سے نجات دلائی مگر خود اپنا محکوم بنا لیا۔ پونا میں اسے ہلکر کے مقابل شکست ہوئی لیکن ابھی وہ دوبارہ وہاں اپنا اقتدار جمانے سے مایوس نہ ہوا تھا اور آغازِ جنگ کے وقت بھی دکن ہی کے علاقوں میں بھونسلا کا شریک و مددگار تھا۔ اِن وسیع ذمہ داریوں نے اوّل تو اس کی فوجی قوت کو منقسم کر دیا دوسرے جنگ چھڑتے ہی انگریزوں نے اعلان کیا کہ مرہٹوں کی فوج کے جو فرنگی یا ہندوستانی سردار و سپاہی نوکری چھوڑ دیں گے انہیں اسی تنخواہ پر کمپنی کی سرکار میں ملازمت دے دی جائیگی۔ چنانچہ بہت سے انگریز اور دوسرے فرنگی جو سب سے زیادہ تعداد میں سندھیا کے ملازم تھے عین لڑائی کے وقت علیحدہ ہو گئے اور اس واقعے نے بھی اس کی جدید قواعد دان فوج کو ایک حد تک کمزور کر دیا[۵۱]۔

جنگ کا پہلا معرکہ اورنگ آباد کے قریب آسئی میں ہوا (ستمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ء) اور قلتِ تعداد کے باوجود ولزلی کے بھائی آرتھر ولزلی نے بھونسلا اور سندھیا کو شکست دی۔ سندھیا نے اپنی فوجیں شمال میں ہٹا لیں اور بھونسلا کو ایک اور شکست کھا کے اطاعت یا اسی قسم کی شرطیں قبول کرنی پڑیں (عہد نامہ دیوگاؤں نومبر ۱۸۰۳ء) جیسی کہ پیشوا مان چکا تھا۔

"مرہٹہ جتھے" میں سب سے زیادہ قوی سردار سندھیا تھا۔ اس کی فوجیں فرنگی سرداروں کے ماتحت آتشی اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعد و اصول کے مطابق مرتب و آراستہ کی گئی تھیں اور مشہور تھا کہ جیسا زبردست توپخانہ سندھیا کا ہے ایسا ہندوستان میں کسی کے پاس نہیں۔ آسئی کی جنگ میں جب سندھیا کو پسپا ہونا پڑا

---

[۵۱] ڈف کی تاریخ مرہٹہ، جلد سوم ۲۴۴

تو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اس لڑائی میں وہ اپنی پوری فوج اور قوت سے کام نہیں لے سکا تھا لیکن اسی سال جنرل لیک نے اس کی شمالی فوجوں کو جا بجا شکستیں دیں اور آخر میں پہلے دہلی کے قریب سندھیا کے بہت بڑے لشکر پر نمایاں غلبہ حاصل کیا (دسمبر ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ) اور پھر آگرہ سے کر الور کے قریب ایک خونریز معرکے میں کامل فتح پائی (جنگ لاسواری اکتوبر ۱۸۰۳ء)

اس طرح چند ہی مہینے کے اندر سندھیا کا زور ٹوٹ گیا اور اسے بھی انگریزوں سے دب کر صلح کرنی پڑی (عہد نامہ سورجی ارجن گاؤں۔ دسمبر ۱۸۰۳ء) جس کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ سندھیا آیندہ "ہندوستان خاص" کے علاقے اور بادشاہ دہلی کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ حقیقت میں یہ انگریزوں کی بہت بڑی کامیابی تھی اور اسی بناء پر اگر ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) کو ممالک ہند پر انکی حکومت کا پہلا سال قرار دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا لیکن اول تو اتنے وسیع ملک پر خاطر خواہ تسلط قائم ہونے میں قدرۃً تاخیر و دشواری پیش آئی دوسرے مرہٹوں کے تیسرے سردار ہلکر کی لڑائیوں نے بھی خلاف امید اس قدر طوالت اور ایسی صورت اختیار کر لی کہ لارڈ ولزلی کو اپنی فتوحات پر پوری طرح خوش ہونے کا موقع نہ مل سکا اور کم سے کم چند سال کے لیئے انگریزی "سیادت" کی تکمیل مشتبہ نظر آنے لگی۔

ہلکر سے لڑائیاں

اندور کے اس مرہٹہ رئیس (ہلکر) کی پونا میں عارضی کامیابی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اوّل اوّل اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تو اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ وہ سندھیا اور بھونسلے کا رقیب تھا۔ دوسرے ہلکر ان قدامت پسند مرہٹوں میں تھا جو تیرھویں صدی ہجری (انیسویں عیسوی) کے شروع ہو جانے پر بھی فن جنگ کے جدید اصول و قواعد کی ہنسی اڑاتے تھے اور کم سے کم اپنی قوم مرہٹہ کے لیئے اسی "قزاقانہ جنگ" کے طریقوں کو مناسب و موزوں سمجھتے تھے جو ملک عنبر حبشی کے زمانے سے لے کر دوسرے پیشوا باجی راؤ کے عہد تک اہل دکن میں بہت مقبول تھے۔ جب سندھیا کو انگریزوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی تو گویا ہلکر کے مذکورہ بالا خیالات کی تصدیق ہو گئی اور اس کی نہ صرف عزت و وقار اپنے ہموطنوں میں بڑھی بلکہ اب ہندوستان بھر میں اسی کی ایک ریاست اور قوت ایسی

رہ گئی جو ممالکِ ہند کے نووارد دعوی داروں سے مغلوب نہ ہوئی تھی؛

ان اسباب نے سیاسی اقتدار کے ساتھ ہلکر کا غرور بڑھا دیا اور حکومتِ انگریزی کی طرف سے مصالحت اور عہد معاونت کی تحریک ہوئی تو اس نے جواب میں اس قسم کے مطالبات کیئے جنھیں ولزلی جیسے شاہانہ مزاج کا آدمی اسقدر فتوحات حاصل کرنے کے بعد کبھی قبول نہ کرسکتا تھا۔ غرض نئے عیسوی سال (۱۸۰۴ء) میں دوبارہ جنگ شروع ہوگئی اور شمالی ہند، گجرات اور دکن تین طرف سے انگریزی افواج نے ہلکر کے علاقوں پر پیشقدمی کی۔ سندھیا نے بھی انگریزوں کی اعانت کا اقرار کیا تھا اور اوّل اوّل اس کے چند دستے انگریزوں کے ساتھ تھے لیکن گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ جب ابتدا میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی تو یہ مرہٹہ سپاہی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہلکر سے جا ملے؛

جنوب آگرہ کے جاٹ اور پنڈاروں کا سرگروہ امیر علی اس لڑائی میں ہلکر کے رفیق ہو گئے تھے اور خود ہلکر کا قول یہی تھا کہ ہمارا ملک وہاں گھوڑے کی زین پر ہے! بالفاظ دیگر یہ وسیع پیمانے پر ایک قزاقانہ جنگ تھی کہ وہ غنیم جو والیان بنگال و اودھ، سلطانِ میسور و سندھیا کی منتظم افواج سے مغلوب نہ ہوسکا شاید ہلکر کے ان بے قاعدہ جرگوں کے ناگہانی حملوں سے تنگ آکر ہٹ جائے؟ اتفاق سے گجرات و دکن کی انگریزی فوجیں بھی وقت پر مالوے نہ پہنچ سکیں اور مالوہ جے پور کی طرف سے جو فوج کرنل مونسن کے ماتحت بڑھی تھی اُسے چنبل کے جنوب میں ہلکر نے سخت شکست دی (جنگ مکن دورا جولائی ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ) مونسن پسپا ہوا اور اس پسپائی میں سخت مصیبتیں اٹھاتا ہوا بیانہ تک آیا۔ اس اثنا میں گریزپا مرہٹے اور پنڈارے برابر انگریزی فوج کے گرد منڈلاتے اور حملے کرتے رہے۔ مونسن کے تھکے ہارے سپاہی آخر ان پیہم حملوں کی تاب نہ لاسکے اور بیانہ کی لڑائی میں انکی صفیں اور ترتیب ٹوٹ گئی اور جس کا جدھر منہ اٹھا فرار ہوگیا (اگست ۱۸۰۴ء)

اس کامیابی نے ہلکر کے حوصلے بڑھا دیئے۔ ہندوستان میں ہر طرف

سلہ تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۲۷۵ و ۲۸۱ و ۲۸۴

سلہ تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۲۸۵

اس کی ہمت و بہادری کے چرچے ہونے لگے اور اگرچہ دکن اور مالوے میں اس کے قدیم مقبوضات پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا لیکن ان باتوں کی اسے چنداں پروا نہ تھی۔ اس کا "ملک وہاں گھوڑے کے زین پر" تھا۔ دوسرے اب وہ آگرے سے بڑھکر دہلی پیشقدمی کر رہا تھا کہ جس طرح ممکن ہو شاہ عالم بادشاہ تک پہنچ جائے اور ظاہر میں لوگوں کی نظر میں وہی رسوخ و مرتبہ حاصل کرے گویا ئے تخت دہلی پر قابض ہونے کی بدولت پہلے سندھیا کو اور اب انگریزوں کو حاصل ہو گیا تھا۔

مگر واضح رہے کہ ہلکر کی ساری کامیابی ایک ایسے پریشان حال لشکر کے مقابلے میں ہوئی تھی جو پہلی ناکامی کے بعد خود ہی جنگ سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ ہلکر کے بے قاعدہ گروہ کسی مستقل مزاج حریف سے جم کر لڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے چنانچہ جب دہلی کی مٹھی بھر انگریزی فوج نے استقلال کے ساتھ مدافعت کی تو چند ہی روز میں ہلکر کے بےچین سپاہیوں کا دل گھبرا گیا اور وہ ہٹ کر دوآب کے علاقوں میں پھیل گئے۔

جنگ ڈیگ و بھرتپور

لیکن اب خود جنرل لیک ہلکر کے مقابلے میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ لائق و مستعد سپہ سالار ہے کہ اگر انگریزوں کی سلطنت ہند کو فقط اُن کی جنگی فتوحات کا نتیجہ سمجھا جائے تو شاید لیک سے زیادہ کوئی شخص انگریزوں میں بانی سلطنت کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔ مگر اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیئے کہ لیک یا دوسرے انگریز سپہ سالاروں کے ماتحت جو سپاہ تھی اس میں قریب قریب تمام ہندوستانی سپاہی تھے اور انھی کو انگریزوں کے ماتحت جدید قواعد جنگ سکھا کر مغربی طور پر مرتب و آراستہ کر لیا جاتا تھا۔ پس انگریزوں کی جنگی فتوحات میں سپاہیوں کا جس قدر حصہ تسلیم کیا جائے گا اس کے حقدار ہندوستان ہی کے باشندے ہوں گے اور "افواج انگریزی" سے بھی یہاں عام طور پر اہل ہند ہی کی وہ فوجیں مراد ہیں جو سرکار کمپنی کی ملازم اور انگریز سرداروں کے ماتحت تھیں۔

القصہ لیک نے نہایت خوبی سے ہلکر کی فوجوں کو ہر طرف سے گھیر گھار کر دوبارہ میوات یعنی آگرہ اور دہلی کے مغرب میں ہٹنے پر مجبور کیا جہاں اس کے جاٹ حلیفوں کے بعض مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے دو قلعوں کی پناہ لے کر ہلکر نے دو بڑی لڑائیاں لڑیں مگر دونوں جگہ ناکامی ہوئی۔ پہلے ڈیگ کا قلعہ انگریزوں نے

تسخیر کر لیا اور اس کے بعد قلعۂ بھرتپور کو گھیر کر کئی مرتبہ یورش کی۔ سپاہیوں کی دلیری اور جاں بازی کے باوجود یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا لیکن ہلکر کی فوجیں مایوس و ناکام ہو کر یہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ لہٰذا اس کے حلیف راجہ بھرتپور نے انگریزوں سے صلح کر لی اور بیس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ اور ہلکر سے قطع تعلق کرنے کی شرطیں مان لیں۔ (۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۱۹ھ)

صلح

ہلکر اپنے جاٹ حلیفوں کو صلح پر آمادہ دیکھ کر وسطی راجپوتانہ میں ہٹ گیا تھا اتفاقاً اسی زمانے میں سندھیا سے ولزلی کی ایسی ان بن ہو گئی کہ دوبارہ جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔ لہٰذا جب تک ہلکر کو امید رہی کہ شاید سندھیا اس کے ساتھ مل کر پھر ایک مرتبہ انگریزوں سے تیغ آزمائی کرے، اس وقت تک وہ اجمیر میں ٹھیرا رہا لیکن اس اثناء میں نظمائے کمپنی نے مختلف اسباب سے جن کا ذکر آگے آتا ہے لارڈ ولزلی کو واپس بلا کر کارنوالس کو دوسری مرتبہ ہندوستان بھیجا (جولائی ۱۸۰۵ء) تو اس نے آتے ہی سندھیا سے مصالحانہ گفتگو شروع کر دی۔ ادھر لیک نے بھرتپور سے رخصت حاصل کرتے ہی پھر تھوڑی سی فوج ہلکر کے تعاقب میں روانہ کی اور اس نے سندھیا کی طرف سے مایوس ہو کر پنجاب کی راہ لی جہاں اسے سکھوں اور افغانوں سے امداد کی توقع تھی۔ مگر لیک بھی برابر دریائے بیاس تک ہلکر کے تعاقب میں چلا آیا تھا اور غالباً اسی کے سر پر آپہنچنے کے رعب سے پنجاب میں شکست خوردہ ہلکر کی فوجی امداد کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا دوسرے کارنوالس اور اس کے جانشین بارلو کی طرف سے صلح کی ایسی نرم شرائط پیش کی گئیں کہ ہلکر نے خوشی سے صلح کر لی اور اپنی ریاست میں چلا آیا (۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ)

۲۔ جنگ و فتوحات جنگ میں وقفہ

ولزلی کی علٰحدگی

آج کل ولزلی کو اس کے ہم وطن سلطنت ہند کے سب سے نامور بانیوں میں شمار کرتے اور بجا طور پر اپنی قوم کا محسن سمجھتے ہیں لیکن اس کی حکومت کے زمانے میں اس کے اولوالعزمانہ منصوبوں کو انگلستان کے اہل الرائے ابتدا سے مخدوش جانتے تھے۔ صرف ولزلی اور اس کے لائق سپہ سالاروں کی پیہم فتوحات نے اُن کی زبان بند کر دی تھی مگر جب ان فتوحات کا سلسلہ رکا اور ہلکر کے مقابلے میں مونسن کو شکست ہوئی تو فوراً وزرائے انگلستان نے ولزلی کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا اور دوبارہ کارنوالس

کو منتخب کیا جس کی صلح پسندی اور دور اندیشی پر پٹ (وزیر اعظم) کو کامل اعتماد تھا وزرا کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ تقویت خود کمپنی کے حصہ داروں سے پہنچی جو ولزلی کے جنگی مصارف برداشت کرتے کرتے عاجز آ گئے تھے۔ بے شبہ نئی فتوحات سے کمپنی کے مقبوضات میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن اول تو ابھی انکی آمدنی پوری طرح وصول نہ ہوتی تھی۔ دوسرے جنگ کے خرچ نے کمپنی کے خزانے کو خالی کر دیا تھا اور کمپنی کے خُرد بیں حصہ دار فقط سالانہ منافع کو دیکھتے تھے اور ان میں سے بعض کی آمدنی کا ذریعہ بھی واقعی یہی منافع تھا لہٰذا آئندہ فوائد کثیرہ کی امید پر وہ وقتی خسارے کی تاب نہ لا سکے اور ان کے ایک بڑے گروہ نے ولزلی کو واپس بلانے پر اصرار کیا۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے کہ ولزلی اپنے منصوبے کو کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا سکے۔ وہ انگلستان بلا لیا گیا اور انگریزوں کی کامل سیادت حاصل کرنے کے کام میں چند سال کا وقفہ پڑ گیا۔

مصالحانہ طرز عمل

لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو بہت ضعیف و علیل تھا اور چند ہفتے کے بعد ہی فوت ہو گیا (اکتوبر ۱۸۰۵ء) لیکن ونسنٹ اسمتھ کے قول کے مطابق "جب تک ہاتھ میں قلم لینے کا دم باقی رہا۔ وہ برابر اپنے پیشرو (ولزلی) کے طریق عمل کو اُلٹنے میں مصروف رہا۔ ۔ ۔ ۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ گوالیار و گوہد، سندھیا کے حوالے کر دیئے جائیں۔ انگریزی علاقے کی سرحد دریائے جمنا قرار دی جائے اور جے پور اور دوسری راجپوت ریاستوں سے قطع تعلق کر کے مرہٹہ لٹیروں کو ان میں لوٹ مار کی بالکل آزادی دے دی جائے۔ ۔ ۔" (صفحہ ۶۰۸)

لیک نے جو اپنی جنگی خدمات کے صلے میں "لارڈ" کے خطاب سے مشرف ہوا تھا، اس آخری طرز عمل کی بہت مخالفت کی لیکن کارنوالس نے کوئی حجت و دلیل نہ سنی اور یہ سمجھ کر اپنی رائے پر قائم رہا کہ جب مرہٹے راجپوتانے کے لڑائی جھگڑوں میں الجھے رہیں گے تو انگریزی علاقوں کو امن ملجائے گا اور کارنوالس کے بعد سر جان بارلو نے بھی اس طریق عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ سر جان کلکتہ کو کونسل کا سب سے پرانا رکن تھا۔ کارنوالس کی وفات پر حسب قاعدہ گورنر جنرلی کا کام اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور نظمائے کمپنی نے بھی اسی کو اس عہدے پر

مستقل کر دیا۔ وہ نظمائے کمپنی اور وزرائے انگلستان کا نہایت مطیع و فرماں بردار تھا اور اسی لیئے کارنوالس کے مصالحانہ طرز عمل پر مضبوطی سے کاربند رہا۔ اُس کی یہی "کمزوری" تھی جس کی بناء پر بعض انگریز مورخ بارلو کو ہندوستان کا "سب سے گھٹیا" (دی سینٹ) گورنر جنرل کہتے ہیں۔ اور شاید اس بات کی بھی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے کہ ولزلی کی مسلسل جنگ و جدال کے بعد امن و امان خود کمپنی کیواسطے مفید اور ضروری تھا کہ چند سال دم لے کر کافی روپیہ اور فوج فراہم کرلے چنانچہ بارلو نے سندھیا اور ہلکر کے ساتھ نرم سے نرم شرطوں پر صلح[۵۲] کرکے، دو ہی سال میں کمپنی[۵۳] کا خالی خزانہ دوبارہ بھر دیا اور حصّہ داروں کو سالانہ منافع کی طرف سے بالکل مطمئن کر دیا[۵۱]!

مزید برآں بارلو کی عدم مداخلت یا کمزوری جو کچھ سمجھیئے صرف ہلکر کے ساتھ معاملہ کرنے میں تھی ورنہ جب نظمائے کمپنی کی طرف سے تحریک ہوئی کہ مرہٹوں کی تالیفِ قلوب کے لیئے عہد نامۂ بسین کی بعض شرائط بھی بدل دی جائیں اور پیشوا کے معاملات میں، جو انگریزوں کی سیادت سے اب بہت ناخوش نظر آتا تھا، دخل کم کر دیا جائے تو بارلو نے شدّت سے مخالفت کی اور اپنے حقوق مداخلت میں ذرا بھی کمی کرنی پسند نہ کی[۵۴]

ویلور کا فساد

بارلو کے عہد کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ ویلور (احاطۂ مدراس) کے ہندوستانی سپاہی بگڑ گئے اور انھوں نے اچانک قلعے پر حملہ کیا جہاں ٹیپو سلطان کے بیٹے گورہ فوج کی حراست میں تھے۔ گوروں کو شکست ہوئی اور وہ اور تمام انگریز افسر مارے گئے۔ باغیوں کا قلعے پر قبضہ ہو گیا لیکن بہت جلد ارکاٹ کی انگریزی سپاہ پہنچ گئی اور اس نے باغی سپاہیوں کو گرفتار کر لیا جنھیں سخت عبرتناک سزائیں دی گئیں ٹیپو سلطان کے بیٹوں کی اس فساد میں کوئی شرکت ثابت نہ ہو سکی۔ تاہم انھیں

---

[۵۱] اوکس ہس صفحہ ۶۰۸

[۵۲] ہلکر کے ساتھ جو صلح ہوئی اس کی قابلِ ذکر شرائط یہ تھیں کہ ہلکر آئندہ بندھیل کھنڈ، ٹونک اور بوندی کی شمالی ریاستوں پر کوئی مطالبہ نہ رکھے گا چنبل کے جنوب میں ہلکر کے مقبوضات واپس دیدیئے جائیں گے اور کمپنی انھیں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے گی! (تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۳۰۹) [۵۳] اس زمانے میں ہندوستان کی آمدنی میں سے خرچ کے بعد جتنا روپیہ بچتا وہ سالِ کے سال نظمائے کمپنی کو ولایت بھیجدیا جاتا تھا (کین جلد اول ۲۴۱ وغیرہ)

[۵۴] اوکس ہس صفحہ ۶۰۹۔ اسیطرح حیدرآباد و اودھ کے معاملات میں اس نے مداخلت کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا اور "عہد معاونت" کی ایک ایک شرط کی سختی سے پابندی کرائی! (دیکھو کین جلد اول ۳۴۰)

یہاں سے ہٹا کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔
انگریزی تواریخ کی عام روایت کے بموجب سپاہیوں کے بگڑنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں احاطۂ مدراس کے فوجی محکمے نے ایک نئی وردی بنوائی تھی اور سپاہیوں کو ڈاڑھی مونچھ کی تراش خراش کے متعلق بھی بعض احکام صادر کیئے تھے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ ماتھے پر تلک وغیرہ لگانے کی ممانعت کر دی تھی ان باتوں سے ہندوستانی سپاہی ناراض ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ انگریز ہمارا مذہب خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اسی زمانے میں عیسائی پادری بھی ملک کے ہر حصے خاص کر مدراس و بنگال میں پھیلتے جاتے تھے۔ غرض انہی اسباب نے آخر کار سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ نظمائے کمپنی کو جب واقعات کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی حکومت مدراس سے ناخوش ہوئے اور وہاں کے گورنر اور فوجی سپہ سالار کو عہدے سے برطرف کر دیا۔ نیز بارلو کی جگہ لارڈ منٹو (اوّل) کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا جو بہت پختہ کار و موقع شناس آدمی تھا۔

لارڈ منٹو

نئے گورنر جنرل کے جولائی ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں عنان انتظام ہاتھ میں لینے کے کچھ عرصے بعد ریاست ٹراونکور میں انگریزوں کے خلاف وہ ہنگامہ ہوا جس نے ویلور کے مفسدے کی طرح ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے انگریز ریزیڈنٹ کی ریاست کے معاملات میں مداخلت، فساد کی اصلی بنا تھی اور اسی مداخلت نے ریاست کے دیوان ویلو تامپی کو اس قدر مشتعل کیا کہ آخر اس نے بہت سے بلوائیوں کے ساتھ ریزیڈنٹ کی قیام گاہ پر حملہ کیا اور گو ریزیڈنٹ بال بال بچ کر نکل گیا لیکن تیس گورہ سپاہی بلوائیوں کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے بعد میں یہ فساد بہت جلد رفع دفع کر دیا گیا لیکن قرینہ کہتا ہے کہ چند سال کے بعد پارلیمنٹ میں جو بحث چھڑی کہ پادریوں کو ہندوستان میں دین مسیحی کی تبلیغ کے واسطے جانے کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے، اس میں زیادہ شدت انہی ویلور و ٹراونکور کے مفسدات سے پیدا ہوئی تھی۔ مگر آخر میں قرار پایا کہ تصدیق نامے (لائسنس) کے ساتھ پادریوں کو ہندوستان آنے کی اجازت دی جائے اور سرکاری طور پر ہندوستان میں ایک لشپ اور چند ماتحت پادریوں کا تقرر بھی منظور کر لیا گیا جن کی تنخواہیں

ہندوستان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھیں ؛

ممالک غیر سے معاملات

ہندوستان کے اندرونی معاملات کا جہاں تک تعلق ہے لارڈ منٹو کے عہد حکومت کا اور کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں نظر آتا۔ خود بھی اس کو سب سے زیادہ انہماک اس میں تھا کہ ممالک ایشیا سے فرانسیسی قوم کا اثر زائل کر دے جو ابھی تک نپولین کے ماتحت اہل انگلستان سے برسر جنگ تھے۔ اسی غرض سے ایران اور سندھ و کابل کو لارڈ منٹو نے سفارتیں روانہ کی تھیں مگر سندھ کے سوا، اور کہیں انگریزی سفیروں کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ جب این رودِ ستلج کے جنوب کی سکھ ریاستوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سیادت قبول کرنے پر انگریزوں کی سیادت قبول کرنے کو ترجیح دی تو لارڈ منٹو نے خوشی سے ان کے تحفظ کا ذمہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سے یہ عہد و پیمان لے لیا کہ وہ آیندہ ان ریاستوں کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا۔ (عہد نامہ امرتسر ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۳ھ)

اسی زمانے میں بحر ہند میں فرانسیسیوں کے خلاف جو مہم انگلستان سے بھیجی گئی اس میں بھی لارڈ منٹو نے نمایاں حصہ لیا۔ افریقہ کے مشرق میں اکثر جزائر پر اہل فرانس کا قبضہ تھا اور لڑائی کے زمانے میں وہ وہاں سے نکل نکل کر انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح ان دنوں مجمع الجزائر شرق الہند کے کئی جزیرے حکومت فرانس کے زیر نگین تھے اور ولندیزی آبادکاروں کی حیثیت محکومانہ رہ گئی تھی۔ ان پر حملے کے وقت خود منٹو جزیرۂ جاوا کی لڑائیوں میں شریک تھا اور اگرچہ اہل فرانس نے وہاں کے شہروں کو نہایت مستحکم اور بہترین اسلحہ سے محفوظ کر رکھا تھا لیکن ہندوستان کی انگریزی فوجوں کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی اور جزیرہ ملکّا اور جاوا انگریزوں نے فتح کر لیئے (۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ) مگر یورپ میں عام صلح کے وقت جاوا کو ولندیزوں کے حوالے کر دیا گیا اور وہ ابتک اس پر قابض ہیں ؛

تجارتی اجارے کی تنسیخ

منٹو کی گورنر جنرلی کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اجارے کی میعاد ختم ہوئی کمپنی کے حصہ دار و حامی اس مدت میں توسیع مزید کے خواہاں تھے کہ ممالک ہند پر جو تسلط اور تجارت کا منافع انہیں حاصل ہے اس میں کوئی فرق نہ آئے لیکن انگلستان کے بعض اہل الرائے کمپنی کی ملکی حکومت اور

تجارتی اجارے دونوں کے خلاف تھے اور اس کو اہل ہند و برطانیہ کے حق میں نہایت مضر ثابت کرتے تھے۔ خود وزیر اعظم (لارڈ گرن ول) کا منشا تھا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات براہ راست حکومتِ انگلستان کے ماتحت کر دیئے جائیں مگر اہل انگلستان کی تجارت پسند طبائع کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ نے حکومت کی ذمہ داریاں لینے سے تو انکار کر دیا البتہ ہندوستان میں کمپنی کو تجارت کا جو اجارہ حاصل تھا اس کی تنسیخ کر دی اور آیندہ سے ہر انگریز تاجر کو ممالک ہند میں بطور خود تجارت کرنے کا حق مل گیا۔

۳ منصوبۂ سیادت کی تکمیل

مارکوئس آف ہیسٹنگز

ارل اوف موئرا، جو ہندوستان کی جنگی خدمات کے صلے میں مارکوئس اوف ہیسٹنگز کا خطاب پا کر تاریخوں میں اسی خطاب سے مشہور رہے، جوانی میں انگلستان کا ایک بدنام امیر زادہ تھا اور جب اونسٹھ برس کی عمر میں کمپنی کے ہندی مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر ہوا (۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۸ھ) تو بقول مورخ ونسنٹ اسمتھ، اس بات کی کوئی امید نہ تھی کہ وہ آخر میں ہندوستان کے سب سے نامور گورنر جنرلوں میں شمار ہوگا، اور یہ ناموری محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ نہیں بلکہ درحقیقت ہیسٹنگز کی عمدہ انتظامی قابلیت جنگی مستعدی اور مشقت پسندی کا واجبی صلہ ہوگی۔ وہ کبھی گرمیوں میں پہاڑوں پر جاکر نہیں رہا۔ بایں ہمہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ علی الصباح چار بجے لکھنے کی میز پر نہ آگیا ہو[1] مگر ہیسٹنگز کے ذاتی حالات میں اس جگہ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس کے سیاسی منصوبے بہت کچھ ولزلی کی مثل تھے اور ابتدا ہی سے وہ ارادہ کر چکا تھا کہ "اگر علانیہ نہیں تو اندرونی طور پر عملاً انگریزی حکومت کی ہند میں سیادت قائم" کر دی جائے[2]۔

جنگ نیپال

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا مقصد جنگ و جدال کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کی بعض بڑی بڑی ریاستوں میں گو قوت نہ رہی تھی۔ پھر بھی قدیم

[1] اوکس ہس۔ ۶۷۰

[2] کین۔ جلد دوم صفحہ ۱۱

خود مختاری کی آن بان باقی تھی۔ دوسرے شمال میں پنجاب و نیپال کے علاقے جو ہمیشہ سے ملک ہند میں داخل سمجھے جاتے ہیں، انگریزی کمپنی کے دائرۂ اثر میں ابھی تک بالکل نہ آئے تھے۔ انہی میں سے ایک ریاست یعنی نیپال کے ساتھ ہیسٹنگز کی پہلی لڑائی ہوئی۔

لڑائی کی تفصیلی وجوہ کسی قدر مشتبہ ہیں مگر اصلی اور تہ کا سبب یہ ہے کہ جب ولزلی نے والی اودھ سے اس کے بہت سے اضلاع لے لیئے (۱۸۰۱ء) تو ان میں گورکھپور بھی تھا جس کی حدود ریاست نیپال کے علاقۂ ترائی سے ملی ہوئی تھیں۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ایک اجنبی اور طاقتور قوم کا اس قدر قریب آجانا گورکھوں کو ناگوار گزرا ہو اور انہی کی طرف سے لڑائی کی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہو۔ منٹو کے زمانے تک ان سرحدی تنازعات کے متعلق خط کتابت ہوتی رہی بلکہ پہلی فروری سنہ ۱۸۱۴ء (۲۵ سنہ آئندہ) تک خود ہیسٹنگز اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ ریاست نیپال سے جو اختلافات تھے وہ خیر وخوبی کے ساتھ طے ہو گئے بلکہ قریب قریب لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد ہم ہیسٹنگز کو وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاری میں مصروف پاتے ہیں۔ گویا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ بزور شمشیر اہل نیپال کے دل پر کمپنی کی سطوت و قوت کا سکہ بٹھا دیا جائے۔

مناسب ہو گا کہ اس جنگ کے حالات ہم مورخ کین کی زبانی سنیں جو قومی طرفداری کے باوجود جنگی واقعات کو واقفیت اور سلیقے سے تحریر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ دشمن کی ریاست چھوٹی سی تھی اور اس کی رعایا میں بیس لاکھ سے کچھ بہت زیادہ نفوس شامل نہ ہوں گے۔ تاہم اس کی حدیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کھٹمنڈو سے ملاؤن کا فاصلہ سات سو میل سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گا اور اس تمام خط پر گورنر جنرل نے، جو خود ہی سپہ سالار بھی تھا، فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا۔ فوج کے الگ الگ چار جیوش (ڈویژن) سے اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھائی کی گئی اور ان انگریزی فوجوں کو توپ و تفنگ اور یورپی فن جنگ کے مطابق ہر قسم کے ساز و سامان سے مسلح کر دیا گیا کیونکہ موئرا کا ہمیشہ کا اصول یہ تھا کہ شروع ہی سے اپنی پوری قوت

۱؎ کین جلد دوم صفحہ ۱۲

کو اس مقام کے محاذ میں فراہم کر دیا جائے جس پر حملہ کرنا مقصود ہے تاکہ لڑائی کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور شروع میں پورا زور و زر صرف کرنے کی تلافی ہو جائے۔ سب سے بڑے جیش میں چوبیسویں نمبر کی گورہ فوج، چھ دیسی پلٹنیں، ہراول (پایونیرز) اور توپچیوں کی مناسب تعداد، غرض کل ملا کر آٹھ ہزار کی جمعیت تھی اور جنرل ماربے (یا ماربلی) کے ماتحت گورکھوں کے دارالحکومت کھٹمنڈو پر حملہ کرنا اسی جیش کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ تین دوسرے جیوش جنرل وُڈ، گلپسی اور اوک ٹرلونی (اختر لونی) کے ماتحت سرحد پر پیشقدمی کر رہے تھے اور ان کی ترتیب داہنی طرف سے بائیں طرف وہی تھی جو جرنلوں کے ناموں کی ترتیب سے ظاہر ہے یعنی اوک ٹرلونی بائیں طرف سب سے آخری سرے پر تھا۔

اس زبردست حملے کو روکنے کے لئے گورکھے بارہ ہزار سے زیادہ باقاعدہ سپاہی فراہم نہ کر سکے تھے لیکن وہ بہت سے مدر کے جیتے ہوئے۔ بڑے پختہ کار و جفاکش سپاہی تھے اور انھیں امر سنہا جیسا لائق و دوراندیش سپہ سالار ملا تھا۔ یہ شخص ذات کا "تھاپا" یعنی زراعت پیشہ لوگوں کے طبقے سے تھا اور گورکھوں کے دوسرے فوجی سردار بھی زیادہ تر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

کلانگا کے معرکے

انگریزی فوج کی پیشقدمی کا اوک ٹرلونی اور گلپسی نے آغاز کیا۔۔۔ جنگ کا جو نقشہ سوچا گیا تھا اس میں اوک ٹرلونی کا یہ تو کام تھا کہ وہ گورکھا فوج کے دائیں جانب بڑھے جہاں خود امر سنہا قیادت کر رہا تھا اور ملاؤں میں اس کا جنگی مستقر تھا۔ مگر ڈیرہ دون کو لے کر مغرب کی طرف یورش کرنا اور اوک ٹرلونی کو کمک پہنچانا گلپسی کے سپرد ہوا تھا۔ ڈیرہ دون میں گورکھوں کی جو جمعیت سردار بال بہادر سنہا کے ماتحت متعین تھی، تعداد و قوت میں اسے ایک چھوٹی پلٹن کے مساوی سمجھنا چاہئے۔ بال بہادر نے شہر سے کوئی چار میل شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑی گڑھی کو اپنا مستقر بنایا تھا جو گرد و پیش کی زمین سے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلند ہے اور اس کی پہاڑی کے دامن میں موضع کالنگا واقع ہے۔ گلپسی نے اوک ٹرلونی کی مدد کو بڑھنے سے پہلے اس گڑھی کو تسخیر کرنا ضروری سمجھا۔۔۔۔ اور اگر اس کے سپاہیوں کے دل میں بھی وہی آگ ہوتی جو گلپسی کے سینے میں

بھڑک رہی تھی اور اگر ماتحت افسر اس کی قرارداد کے مطابق مل کر اپنا اپنا فرض بجا لاتے تو گلیسپی کی تدبیر چل جاتی اور شاید جنگ چند ہفتے میں ختم ہو جاتی لیکن ان منصوبوں کے خلاف جو کچھ ظہور میں آیا وہ یہ تھا کہ انگریزی فوج کو شدید نقصان کے ساتھ ایسی ناکامیابی ہوئی جو سخت ذلت کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ بہت سی قیمتی جانوں کے ساتھ خود جنرل گلیسپی کی جان بھی اسی میں ضایع ہوئی اور جنگ کا سلسلہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ بال بہادر نے انگریزوں کے تین حملے روکے اور ان معرکوں میں انگریزی سپہ سالار (جنرل گلیسپی) اور اور بہت سے افسروں کے علاوہ سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کو تلوار کے گھاٹ اتارا جو اس کی مٹھی بھر گورکھا فوج سے کہیں زیادہ تھی! آخر کار جب گڑھی کے سامنے قلعہ شکن دبابہ لگایا گیا اور محصورین کا پانی بند کر دیا گیا تو اس وقت ان جانباز پہاڑیوں نے جو شمار میں صرف ستر رہ گئے تھے گڑھی خالی کر دی (ماہ نومبر) کیونکہ اب اس میں ٹھیرنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ جاں باز صحیح سلامت بچ کر گڑھوال کی پہاڑیوں میں نکل گئے۔

اس افسوسناک ناکامی سے یہی نہیں کہ مغربی جیش کی پیشقدمی میں تاخیر واقع ہوئی بلکہ درحقیقت اسی نے گلیسپی کی فوج کے علاوہ دوسری مشرقی فوجوں کے سرداروں اور سپاہیوں کو بھی سخت بددل کر دیا۔ جو فوج مارلے کے ماتحت کھٹمنڈو کی طرف چڑھائی گئی تھی۔ اس کو نہایت ہی نااہل افسر ملے تھے اور ہر چند اس جیش کو صرف سو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے مارلے جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا اور عذر یہ کیا کہ توپوں کی مزید تعداد آجانے کا انتظار ہے۔ اس نے اپنے آگے بڑھے ہوئے دستوں کو بھی کافی مدد نہ پہنچائی اور جنوری ۱۸۱۵ء میں گورکھا فوج نے حملہ کر کے ان میں سے بعض دستے کاٹ دیئے جن میں بہت سے سپاہیوں اور انگریز افسروں کی جانیں گئیں۔ پھر تازہ کمک آنے پر اگرچہ مارلے کی فوج کی تعداد تیرہ ہزار تک بڑھ گئی اور دشمن کی سپاہ سے قریب قریب دس گنی ہو گئی تھی۔ بایں ہمہ مارلے نے قدم آگے نہ اٹھایا اور بالآخر اس قدر پست ہمتی دکھائی کہ دس فروری کو رات کے وقت تن تنہا گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے مستقر دانا پور کی طرف بھاگ آیا۔ اس کی جگہ کرنل وڈ نے لی اور اسے ایک عارضی

کامیابی بھی ہوئی یعنی کھٹمنڈو کا راستہ انگریزی فوج کے لئے صاف ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد جنرل وُڈ آ پہنچا مگر اس نے بھی مارلے سے کچھ زیادہ ہمت و مستعدی نہ دکھائی۔ خلاصہ یہ کہ گرمی آنے پر یہ جیلشپی گرمائی مقامات میں ہٹ آیا اور جنگ میں کوئی کارنمایاں انجام نہ دے سکا۔ اسی طرح دوسرے مشرقی جیلش کو جو وُڈ کے ماتحت تھا کئی زکیں پہنچیں اور وہ بھی ہٹ کر گورکھپور چلا آیا"

انگریزی افواج کی ان ناکامیوں نے، جیسا کہ کین اور دوسرے مورخوں نے صراحت کی ہے، ہندوستان میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و فساد کے آثار پیدا کر دیئے تھے اور بہت سے انگریز اہل الرائے نیپال سے مصالحت یا جنگ موقوف کرنے کا جس طرح بھی ممکن ہو مایوسانہ مشورہ دینے لگے تھے لیکن ہیسٹنگز اپنے ارادے پر استقلال سے قائم رہا اور برسات کے ختم ہوتے ہی اس نے تازہ کمک اور ساز و سامان کے ساتھ فوج کشی کے احکام جاری کئے۔ اس مرتبہ اس کے عزم و تدبیر کی قسمت نے بھی یاوری کی۔ اور اب گارڈنر نامی ایک انگریز کے مشورے سے خط جنگ کے اس مغربی سرے پر نیپالیوں کے مقابلہ میں حملہ کیا گیا جہاں علاقۂ کماؤن کے پہاڑی باشندے نیپالی حکومت کے خلاف انگریزوں کے طرفدار بنا لئے گئے تھے۔ گارڈنر پہلے مرہٹوں کی فوج میں نوکر تھا اور اسی زمانے میں جنرل لیک نے اس کو ضلع ایٹہ میں فوجی امداد کے عوض میں ایک جاگیر دلوا دی تھی گارڈنر کی تدبیر چل گئی اور ایک مرتبہ ناکامیابی کے بعد دوسری دفعہ الموڑا پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا جہاں کا سردار بام ساہ نہ گورکھالی قوم سے تھا نہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں کچھ زیادہ مستعدی دکھائی۔

الموڑے کی تسخیر نے گورکھا فوج کو دو حصوں میں اس بری طرح کاٹ دیا کہ پھر وہ اپنی مغربی سرحد پر خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے اور بالائی ستلج کی طرف سے اوک ٹرلونی کی پیشقدمی کا راستہ آسان ہو گیا ہلکر کے مقابلے میں اوک ٹرلونی کا پایۂ تخت دہلی کو دلیری سے بچانے کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ نیپال کی جنگ میں بھی اسی انگریز سپہ سالار کی ہمت و قابلیت سے فتح حاصل ہوئی اور امر سنہا نے ملاؤن میں گھر کر ہتیار ڈال دیئے (مئی ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۲۹ھ) اسی طرح گورکھا

فوج کے کئی دستوں نے جا بجا گھر کر انگریزوں کی اطاعت (اور پھر فوجی ملازمت) قبول کر لی۔

مذکورۂ بالا واقعات نے دربارِ نیپال کو انگریزوں کی شرائط صلح ماننے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسی اثنا میں اس ریاست کو سلطنت چین کی طرف سے مدد کی امید پیدا ہوئی اور وہ سابقہ قرارداد ماننے میں لیت و لعل کرنے لگی۔ لہٰذا اوکٹرلونی پھر اپنی فوج لے کر نیپال کے دار الحکومت پر بڑھا اور آخر کار مارچ ۱۸۱۶ء (۱۲۳۰ھ) میں عہدنامہ سگولی پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے کالی ندی کے مغرب میں گڑھوال، کماؤں اور ترائی کے کئی اضلاع نیپالیوں نے کمپنی کے حوالے کر دیئے اور کھٹمنڈو میں انگریز ریذیڈنٹ کا رکھنا منظور کر لیا جسے وہ معاہدے کی سب سے سخت شرط سمجھتے تھے۔[۱]

پنڈاروں کا استیصال

جنگِ نیپال سے فرصت پانے کے بعد مارکوئیس آف ہیسٹنگز ہندوستان کے علاقوں میں اندرونی امن و امان اور نیز پوری طرح انگریزی سیادت قائم کرنے پر متوجہ ہوا۔ اس اندرونی امن و امان میں سب سے زیادہ خلل پنڈاروں نے ڈالا تھا جن کی تعداد کثیر وسط ہند کے علاقے تاخت تاراج کرتی پھرتی تھی۔ اسی طرح ہلکر و سندھیا کی فوجوں نے راجپوتانہ میں سخت ہنگامہ بپا رکھا تھا اور وہاں کی ریاستوں پر آئے دن یورشیں کرتی رہتی تھیں۔ مگر یہ بے قاعدہ فوجیں اب برائے نام "مرہٹہ" رہ گئی تھیں ورنہ ان میں زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمان سپاہی شریک تھے اور ان میں پٹھانوں کی تعداد غالب تھی جس کی وجہ سے اب ان سب کو عام طور پر انگریزی تاریخوں میں "پٹھان" لکھ دیا ہے اسی طرح "پنڈاروں" کا لفظ بھی خاص کسی قوم یا گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس سے وسطِ ہند کے وہ لٹیرے مراد ہیں جنھوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی (تیرھویں ہجری) کے آغاز میں نہایت خطرناک قوت بہم پہنچا لی تھی اور جن میں ہندو مسلمان ہر قوم اور قریب قریب ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔ درحقیقت پنڈاروں کو لوٹ مار کی مشق مرہٹوں نے کرائی تھی اور ابتدا میں یہ لٹیرے انہی کی رفاقت میں بلکہ ہدایت سے کے

۱؎ مذکورۂ بالا حالاتِ جنگ کا ماخذ کلین کی تاریخ جلد دوم (صفحات ۱۹۰ تا ۲۰۰) ہے نیز دیکھو اوکس پس صفحہ ۲۴۲ وغیرہ

۲؎ اس عنوان کی ذیل کے حالات گزیٹیئر جلد دوم (صفحات ۹۵ و ۴۹۳) اور اوکس فورڈ ہسٹری (صفحات ۶۲۵ تا ۶۲۹) سے ماخوذ ہیں۔

مطابق مختلف علاقے تاراج کرتے تھے۔ لیکن جب مرہٹوں کے سرگروہوں نے اپنی ترک تازی چھوڑ کر مستقل ریاستیں قائم کر لیں تو گو پنڈاروں کے بعض سرداروں کو بھی مستقل جاگیریں مل گئیں لیکن ان کے زیادہ تر افراد ایسے تھے جن کا لوٹ مار کے سوا کوئی پیشہ اور مشغلہ نہ تھا۔ اور چونکہ ان کا نہ کوئی وطن تھا نہ صحیح معنی میں کوئی مذہب، لہذا ان کے اخلاق و اطوار کی حالت خراب تھی اور غالباً کوئی ایسی وحشیانہ سفاکی نہ ہو گی جس کا ارتکاب کرنے میں ان کو باک ہو۔

پنڈاروں کے اصلی مامن تو مالوے کے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں تھے مگر انکی تاخت تاراج کا دائرہ بہت وسیع تھا اور سو سو دو دو سو سے لیکر بعض اوقات دس دس ہزار کے گروہوں میں وہ اپنے مقام سے نکل کر جدھر موقع ملتا حملہ کر کے ضلع کے ضلع پامال و خراب کر جاتے تھے۔ انگریزی تاریخوں میں امیر خاں کو بھی پنڈاروں کا سرگروہ بتایا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس گروہ میں قزاقی کی جو خصوصیات تھیں وہ امیر خاں میں نہ تھیں اس لئے پنڈاروں میں اسے شمار کرنا درست نہیں۔ پنڈاروں کے دوسرے سرگروہوں میں واصل، کریم اور چیتو مشہور ہیں اور ایک مرہٹے امباجی کا بھی جابجا نام آتا ہے جس نے جنوبی راجپوتانے میں آٹھ برس تک وہاں کے باشندوں کو لوٹا اور پریشان کیا۔

اگرچہ اب پنڈاروں کا مرہٹہ فوجوں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا تھا کیونکہ اس قسم کی مرہٹہ فوجیں ہی رفتہ رفتہ غائب ہو گئی تھیں جن کے ساتھ پنڈاروں کا ہونا گویا قدرتی بات تھی تاہم وسط ہند کی بڑی بڑی مرہٹہ ریاستوں کی طرف سے پنڈاروں کو ابتک کچھ نہ کچھ مدد ملتی تھی اور چیتو علانیہ اپنے آپ کو راجہ سندھیا کا ملازم بتاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہیسٹنگز کو ان قزاقوں کی سرکوبی میں خاص احتیاط اور جنگی تیاریاں کرنی پڑیں اور اس نے شمال و جنوب کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار انگریزی فوج میدان میں اتاری۔ جس کے برابر تعداد میں اس وقت تک انگریزوں کی فوج کبھی فراہم نہ ہوئی تھی[۱]۔

مقاصد و تدابیر

یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان زبردست جنگی تیاریوں کی تہ میں دیگر مقاصد و مصالح بھی مضمر تھے

[۱] اس میں تیرہ ہزار کے قریب گورہ سپاہی اور تین سو توپیں تھیں۔

کیونکہ ہیسٹنگز افواج کمپنی کی آراستگی اور فراہمی کے ساتھ ساتھ وسطِ ہند، راجپوتانے اور دکن کی قریب قریب تمام چھوٹی بڑی ریاستوں سے خط کتابت کر رہا تھا کہ ہندوستان کے جو امیر و رئیس اب تک علیحدہ رہے ہیں وہ کمپنی کی سیادت تسلیم کر لیں اور جنھوں نے بادلِ ناخواستہ یہ سیادت تسلیم کی ہے اُن کو اور زیادہ کمزور یا کم سے کم مرعوب کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں خاصی کامیابی ہوئی۔ بھوپال، اودے پور، جودھپور اور کوٹہ کے رئیسوں نے کمپنی کی سیادت اور دوستی کو قبول کر لیا (۱۸۱۷ء) باجی راؤ پیشوا اپنے پہلے "عہد معاونت" سے کچھ خوش نہ تھا۔ اس موقع پر اُسے بھی دباکر کوکن کا علاقہ اور اُن حقوق سے دست برداری لے لی گئی جو بحیثیت پیشوا باجی راؤ کو دوسرے مرہٹہ رئیسوں پر حاصل تھے۔ (عہد نامۂ پونا ۱۸۱۷ء) اس واقعے نے باجی راؤ کو انگریزوں کا سخت مخالف بنا دیا اور وہ بھونسلا راجہ کے ساتھ مل کر انگریزوں کی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کا درپردہ ساز باز کرنے لگا۔

سندھیا، ہلکر اور امیر خاں سے انگریزوں کے نامہ و پیام جاری تھے اس لیے وہ پنڈاروں کی کوئی مدد وقت پر نہ کر سکے بلکہ امیر خاں کو ریاست ٹونک دے کر خوش اور مطمئن کر دیا گیا۔ اور پنڈاروں کے باقی جتھوں کو انگریزی افواج نے گھیر گھیر کر جا بجا گرفتار یا ہلاک کیا۔

انگریزی مورخوں کا بیان ہے کہ چند مہینے کے اندر ان خوفناک قزاقوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ ان کے تین مشہور سرغنوں میں سے کریم نے انگریزوں کی اطاعت۔ اور ضلع بستی میں ایک جاگیر لینی قبول کر لی واصل خود کشی کر کے مرا اور چیتو کو اسیر گڑھ کے جنگلوں میں جہاں وہ بھاگ کر چھپا تھا، شیر نے پھاڑ کھایا۔

لیکن اس اثناء میں قرائن کے مطابق، زیادہ طاقتور حریف یعنی مرہٹہ رئیسوں سے لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ جنگ مرہٹہ میں ان رئیسوں کی قوت انگریزوں سے شکست کھانے اور باہمی نااتفاقی کی بدولت بہت کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ بایں ہمہ اب تک ممالک ہند میں اگر کسی کے دل میں انگریزوں سے ہمسری کا دعویٰ اور اپنی آزادی کا جوش باقی تھا تو وہ یہی مرہٹہ رئیس تھے۔ اس بات کو انگریز اہل الرائے خوب سمجھتے تھے اور لارڈ ہیسٹنگز کے طرزِ عمل میں

مرہٹوں کے ساتھ جو کاوش جھلکتی ہے اس کا ایک سبب بظاہر یہی تھا کہ اب اُسے اُن کی رہی سہی آزادی اور انگریزوں کے ساتھ ہمسری ناگوار گزرتی تھی۔

آخری جنگ مرہٹہ

الغرض پیشوا اور بھونسلا سے تو اس بنا پر کہ انھوں نے دھوکے سے انگریزی فوج پر حملہ کیا تھا، لڑائی چھڑی اور ہلکر سے مخاصمت کا سبب یہ قرار دیا گیا کہ اس نے پنڈاروں کے سرغنوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ یہ اسباب جنگ بے بنیاد نہ تھے لیکن انصاف یہ ہے کہ عداوت و نزاع کی اصلی بنا وہ معاہدہ (عہدنامۂ پونا) تھا جس پر باجی راؤ سے جبراً دستخط کرائے گئے تھے[1]۔ باقی اندور پر انگریزوں کی فوج کشی کا اصلی سبب اس ہلچل اور بدنظمی کو قرار دینا چاہیے جو کہ جسونت راؤ ہلکر کی وفات (۱۸۱۱ء) سے اس ریاست میں پیدا ہو گئی تھی۔

بہرحال، جنگ میں ہر جگہ مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انھیں کمپنی کے سامنے، جس نے دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قوت بہم پہنچالی تھی سرنگوں ہونا پڑا۔ پیشوا باجی راؤ کو تو اس فوج نے جو خود اس کے خزانے سے تنخواہ پاتی تھی اور عہد معاونت کی رو سے انگریز افسروں کے ماتحت پونا کے قریب متعین تھی، دو شکستیں دے کر ملک سے باہر بھگا دیا اور خاندیس کے علاقوں میں مارے مارے پھرنے کے بعد آخر اُس نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی (جون ۱۸۱۸ء مطابق ۱۲۳۳ھ)۔ ناگپور کی مرہٹہ فوجوں نے اتنا بھی استقلال نہ دکھایا اور بلوائیوں کی طرح ایک حملہ کرنے کے بعد وہاں کے راجہ آپا صاحب اور اس کے سپاہیوں کا جوش فرو ہو گیا۔ اُسکی فوج کے عرب سپاہی بطور خود کچھ روز تک مقابلہ کرتے رہے لیکن ایک منتظم قوت اور سلطنت کے مقابلے میں اس قسم کے ہنگامے کچھ دیرپا نہیں ہو سکتے۔ چند ہی ہفتے کے اندر یہاں بھی انگریزوں کو کامل غلبہ حاصل ہو گیا۔ (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس تمام جنگ مرہٹہ میں سب سے سخت معرکہ جسونت راؤ

---

[1] جب تک انگریزی فوجوں نے (جن کی تنخواہ "عہد معاونت" کی رو سے خود پیشوا کو دینی پڑتی تھی) پونا کا محاصرہ نہ کر لیا، باجی راؤ انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کرتا رہا۔ بہ الفاظ دیگر اس نے مذکورۂ بالا معاہدہ بالکل مجبور ہو کر کیا تھا (دیکھو تاریخ مرہٹہ جلد ثالث صفحہ ۳۸۵۔ نیز اوکس بس صفحہ ۶۲۹)

ہلکر کی فوجوں سے پیش آیا؛ حالانکہ اس راجہ کی وفات (۱۸۱۱ء) کے بعد وہاں صحیح معنی میں کوئی ایسا ذی اقتدار شخص نہ رہا تھا جس کی سب لوگ اطاعت کرتے؛ متوفی کا متبنٰی جانشین (ملہار راؤ) نابالغ لڑکا تھا اور اس کی جانب سے حکومت جسونت راؤ کی بیوہ رانی (تلسی بائی) کرتی تھی۔ اس جنگ کے موقع پر وہ انگریزوں سے مصالحت یا اطاعت پر مائل تھی لیکن فوج کے سرداروں نے اس کو قتل اور انگریزوں کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ انگریزی افواج سے ان کا خونریز مقابلہ مہدپور کے مقام پر ہوا (دسمبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ) جو اجین سے کوئی بیس میل شمال میں واقع ہے آخر میں انگریزی فوج کو فتح ہوئی اور اس واقعے سے نہ صرف اندور کی ریاست بالکل قابو میں آگئی بلکہ سندھیا بھی مرعوب ہو گیا؛

اہم نتائج

اس طرح، ۱۸۱۹ء (۱۲۳۴ھ) کے ختم تک نہ صرف پنڈاروں کا استیصال ہوا بلکہ تمام مرہٹہ رئیس کمپنی کے مطیع ہو گئے جس کے معنی یہ تھے کہ ممالک ہند میں سندھ و پنجاب اور نیپال و برما کے سوا کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو انگریزوں کی سیادت کو تسلیم نہ کرتی ہو اور اُن چار میں بھی جو آزاد رہیں نیپال و برما صحیح معنی میں ہندوستان کے اندر داخل نہیں، اور شمالی پنجاب و سندھ بھی گزشتہ زمانے میں "ہندوستان خاص" کے باہر سمجھے جاتے تھے۔ بہر حال، ان چار علاقوں کو چھوڑ کر ہند و دکن کے باقی سب علاقے بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریزی کمپنی کے زیر نگیں آگئے۔ گویا ولزلی کے منصوبے کی ہیسٹنگز نے تکمیل کر دی؛

اُن تمام معاہدات کا ذکر کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں جو اس موقع پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے کیے گئے تھے۔ اجمالاً صرف جنگ مرہٹہ کے یہ اہم نتائج بیان کرنے کافی ہوں گے کہ (باجی راؤ) پیشوا کو وظیفہ دے کر کانپور بھیج دیا گیا اور اس منصب کے خاتمے کے ساتھ اس کی تمام ریاست پر، بہ استثنائے ضلع ستارا، انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ستارا میں سیواجی کے قدیم خاندان کے وارث کو رئیس مان لیا گیا تھا لیکن اس ریاست کو بھی چند سال بعد لارڈ ڈلہوزی نے ضبط کر لیا جس کا حال ہم آگے پڑھیں گے۔ اسی طرح بھونسلا خاندان کے پاس صرف ناگپور کے چند اضلاع چھوڑ کر باقی پورے علاقے پر

ہیسٹنگز نے قبضہ کرلیا۔ ہلکر کی ریاست کے کئی ضلع مستقل طور پر لے لیئے گئے اور ملھار راؤ کی نابالغی کے زمانے تک باقی علاقہ بھی وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کے زیر حکومت رہا۔

راجپوتانے کا کوئی بڑا علاقہ ہیسٹنگز نے لینا پسند نہیں کیا مگر یہاں کی ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ان میں کمپنی کو راجپوت ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرنے کا حق مل گیا اور قریب قریب اسی اصول پر وسط ہند کی دوسری ریاستوں سے معاہدے کر لیئے گئے۔ اسی ضمن میں کچھ کی ریاست کا بھی ذکر کردینا چاہیئے جہاں کے رئیس نے پہلے کمپنی سے اتحاد و دوستی کا عہد کرلیا تھا لیکن بعد میں انگریزوں کی مداخلت سے تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوا اور ہیسٹنگز نے ایک فوج بھیجکر اسے شکست دی۔ راجہ نے اطاعت قبول کرلی تھی مگر ہیسٹنگز نے اُسے معزول کردیا اور اس کے صغیر سن بیٹے کی جانب سے حکومت انگریز ریذیڈنٹ کو سونپ دی۔ (۱۸۱۹ء)

قبضہ سنگاپور

لارڈ ہیسٹنگز کے عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ قبضہ سنگاپور ہے جو ان دنوں ایک چھوٹا سا مچھیروں کا جزیرہ تھا اور اب سلطنت برطانیہ کی مشرقی تجارت اور بحری قوت کا مرکز بن گیا ہے۔ دراصل نپولین بوناپارٹ کی آخری شکست و قید کے بعد جب جاوا دوبارہ ولندیزوں کو دیا گیا (۱۸۱۵ء) تو جزائر شرق الہند اور چین و جاپان سے بحری تجارت کے تمام راستے انہیں ولندیزوں کے زیر اقتدار آگئے اور اسی کی تلافی کے لیئے ہیسٹنگز نے نظمائے کمپنی کی پسند و ناپسند کا لحاظ کیئے بغیر جزیرۂ مذکور پر قبضہ کرلیا اور ولندیزوں کی ناراضی کی بھی چنداں پرواہ کی۔ سنگاپور کی بعد کی ترقی اور موجودہ اہمیت ہیسٹنگز کے عمدہ انتخاب اور دور اندیشی کا بدیہی ثبوت ہے۔

مختلف واقعات

لارڈ ہیسٹنگز کے جس طرح عملاً کمپنی کی سیادت ہندوستان میں قائم کی اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ وہ قدیم رسمیں بھی ترک کردی جائیں جو کمپنی کی اس جدید سیادت و منزلت کے منافی تھیں۔ چنانچہ گو شاہ عالم بادشاہ کے نام کا سکہ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۰ھ) تک ضرب ہوتا رہا لیکن خاص خاص درباری موقعوں پر کمپنی کی طرف سے جو نذریں دی جاتی تھیں۔ وہ ہیسٹنگز نے موقوف کردیں۔ یوں بھی شاہ عالم کے بعد "شاہِ دہلی" کی حیثیت کمپنی کے معمولی وظیفہ خوار کی سی ہوتی جاتی تھی اور "قلعہ معلی" جہاں ایک زمانے میں

ہندوستان کی قسمت کے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ اب محض کسی امیر کی حویلی رہ گیا تھا۔ شاہِ دہلی کے رسمی اعزاز کو ختم کرنے کی ایک اور تدبیر یہ کی گئی کہ نواب وزیر والیٔ اودھ اور نواب نظام الملک آصفجاہ کو ہیسٹنگز نے لقب بادشاہی اختیار کرنے پر آمادہ کیا لیکن باوفا چین قلیچ خاں کی اولاد نے ایسی عزت قبول نہ کی جس میں شکستہ حال شاہانِ دہلی کی اہانت کا پہلو مضمر تھا۔ البتہ والیٔ اودھ نے جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، یہ لقب اختیار کر لیا۔[۱]

ہیسٹنگز کے دیگر ملکی انتظامات کا بھی اسی مقصد کمپنی کی حکومت کو مضبوطی سے ہندوستان میں قائم کرنا نظر آتا ہے۔ یہ طریقہ کہ ضلع کے محصّل یا کلکٹر کو وسیع انتظامی اور فوجداری اختیارات دیدیئے جاتے ہیں ہیسٹنگز ہی نے جاری کیا تھا اور اب تک یہی طریقہ زیرِ عمل ہے۔ اسی طرح "رعیت داری" بندوبست کو بھی ہیسٹنگز کے زمانے میں بڑی وسعت دی گئی جس میں "زمیندار" یا "جاگیردار" کا رعیت سے واسطہ ہٹا کر سرکار براہ راست کاشتکاروں سے سرکاری لگان وصول کرتی ہے۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں رعیت سے بلا واسطہ لگان وصول کرنے کا طریقہ مدت سے رائج تھا لیکن سلطنت کی طرف سے بالعموم بڑے بڑے موروثی زمیندار دیہات کے مالک قرار دیدیئے جاتے تھے اور زمین کی پیداوار یا مالگزاری میں پہلا حق انھی زمینداروں کا ہوتا تھا۔ رعیت واری طریقے میں فائدہ یہی نظر آتا ہے کہ زمیندار کا حق بھی سرکار ہی کو مل جاتا ہے اور اس لیئے وہ مالگزاری بڑھا سکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہر کاشتکار سے وصولِ مال کے لیئے سرکار کو ملازمین کا عملہ بڑھانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سرکاری ملازمین کاشتکاروں سے وہ ہمدردی اور انکی مختلف ضروریات سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے جو اُن کے مقامی اور موروثی زمینداروں کو ہو سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عام طور پر زراعت اور اہلِ زراعت کے حق میں اچھا نہیں نکلتا۔ چنانچہ ہیسٹنگز کے زمانے میں جب کمپنی کے نئے مقبوضات میں رعیت واری بندوبست ہوا تو اول تو مالگزاری کی شرح بہت بڑھا چڑھا کے تشخیص کی گئی دوسرے اس کے وصول کرنے میں بعض مقامات کی رعایا پر ناگفتہ بہ

---

[۱] اوکس ہسٹ صفحہ ۱۴۶

سختیاں ہوئیں[۱]۔ آخر کار تقریباً تیس برس کے بعد مسٹر ہیسٹنگز کی قرار دادہ شرح مالگزاری کو گھٹانا پڑا۔ پھر بھی ہندوستان کے جن صوبوں میں سالانہ رعیت واری طریقہ رائج ہے وہاں کے زراعت پیشہ باشندوں کی حالت بالعموم دوسرے صوبوں کے زمینداروں سے گری ہوئی ہے ؎

[۱] اوکسانا ہس صفحہ ۶۴۵ وغیرہ

باب پنجم

مزید مقبوضات اور آغاز بادشاہی

۱۔ بعض اندرونی اصلاحات اور بیرونی لڑائیاں

مارکوئیس اوف ہیسٹنگز کے جانے کے بیس اکیس برس بعد تک ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کوئی بڑی لڑائی پیش نہیں آئی۔ اور برما یا افغانستان کی جنگ بیرونِ ہندوستان کی لڑائیاں ہیں۔ یوں بھی اس عرصے میں ولیم بن ٹنگ کے سوا کوئی ایسا گورنر جنرل مقرر نہ ہوا جو اپنی قابلیت کا نقش چھوڑ جاتا۔ غرض اس زمانے کی تاریخ مختلف غیر مسلسل واقعات کا غیر دلچسپ سا مجموعہ رہ گئی ہے، اور ہمیں ان واقعات کو علٰحدہ علٰحدہ سنہ وار بیان کر دینا ہی کافی ہوگا۔

پہلی جنگِ برما

ہندوستان سے جاتے وقت (جنوری ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۳۸ھ) ہیسٹنگز کونسل کے سب سے پرانے رکن کو اپنا جانشین بنا گیا تھا اور لارڈ ایمہرسٹ کے آنے تک (اگست ۱۸۲۳ء) وہی حکومت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایمہرسٹ کے عہدِ حکومت (۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۳ھ) کا سب سے مشہور واقعہ "پہلی جنگِ برما" ہے جو انگریزی روایتوں کے بموجب حکومتِ برما کی دست درازی کی وجہ سے چھڑی۔ واضح ہے کہ اراکان پر برما کے راجہ کا بہت سال پہلے قبضہ ہو چکا تھا اور اس کی سرحدیں جنوب مشرقی بنگال سے متصل ہیں لیکن چند ہی سال پہلے ریاست آسام میں خانہ جنگی ہوئی اور جب متخاصمین انگریزی امداد نہ حاصل کر سکے تو بعض نے حکومتِ برما سے اعانت کی درخواست کی جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ خود اہلِ برما۔ آسام پر قابض ہو گئے (۱۸۱۷ء) اور اسی وقت سے ان کے انگریزوں کے ساتھ آئے دن سرحدی جھگڑے رہنے لگے لیکن جب کمپنی کو ہندوستان کی لڑائیوں سے فرصت ہوئی اور مصالحانہ گفتگو سے خاطر خواہ کام نہ چلا تو برما کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔

(مارچ ۱۸۲۴ء مطابق ۱۲۳۹ھ) اور انگریزی افواج نے آسام پر بری اور جنوبی برما پر بحری حملہ کیا۔ آسام کا بری حملہ بعض ناکامیوں کے بعد کامیاب ہوا لیکن جنوبی برما کی لڑائی میں خلافِ امید بہت طوالت ہوئی اور شہر رنگون پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے باوجود اہلِ برما استقلال و ہمت کے ساتھ حملے کرتے رہے۔ آخر اپریل ۱۸۲۵ء (سنہ ۱۲۴۰ھ) میں ان کا لایق سپہ سالار مہابندولا مارا گیا جس سے برمی فوج کی ہمت پست ہو گئی اور پھر وہ پایۂ تخت آوا پر انگریزوں کی پیش قدمی کو نہ روک سکی حملہ آور مقام ینڈبو تک بڑھ آئے جہاں سے پایۂ تخت آوا صرف چار منزل دور رہ جاتا ہے اور اسی مقام پر صلح کی شرائط طے ہوئیں (عہد نامہ ینڈبو فروری ۱۸۲۶ء مطابق ۱۲۴۱ھ) حکومت برما نے آسام و اراکان کا ملک اور ساحل تناسرم حملہ آوروں کے حوالے کیا اور ایک کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ دینا قبول کر لیا جس کے بعد انگریزی فوجیں رنگون اور جنوبی برما سے واپس ہٹ آئیں۔

ایمہرسٹ کے عہد کا ایک اور مشہور واقعہ بھرتپور کی تسخیر ہے (۱۸۲۶ء) اس ریاست نے ہیسٹنگز ہی کے زمانے سے انگریزی سیادت قبول کر لی تھی لیکن جب راجہ کی وفات پر دہلی کے انگریزی رزیڈنٹ نے اس کے صغیر سن بیٹے کو وارث قرار دیا تو متوفی راجہ کے بھائی نے یہ قرارداد منظور نہ کی اور اپنی جانشینی کا اعلان کر دیا جنگ برما کی ابتدائی ناکامیوں اور پریشانیوں کی وجہ سے اول اول ایمہرسٹ بھرتپور پر فوج کشی کرنے کے خلاف تھا لیکن ۱۸۲۶ء میں رضامند ہو گیا اور انگریزی سپہ سالار لارڈ کومبرمیر نے بھرت پور کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری اس مرتبہ بھی قلعے کا کچھ نہ بگاڑ سکی مگر محاصرین فصیل تک سرنگ لگانے میں کامیاب ہو گئے اور بارود بھر کے فصیل کا ایک حصہ اڑا دیا۔ پھر انگریزی فوج نے یورش کی اور قلعۂ بھرتپور مسخر ہو گیا۔[1]

لارڈ ولیم بنٹنگ

ایمہرسٹ کا جانشین۔ لارڈ ولیم بنٹنگ انگلستان کے شاہی خاندان سے تھا اور پہلے احاطۂ مدراس کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ مدراس میں اس کا عہد حکومت

---

[1] چونکہ لارڈ لیک کے زمانے میں اس قلعے کا محاصرہ اور انگریزی افواج کی ناکامی مشہور ہو گئی تھی لہٰذا اکثر انگریز اس کی تسخیر کو گذشتہ بدنامی رفع کرنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور غالباً اسی جوش و کد کا اثر تھا کہ فتح کے بعد راجہ کے محلات کو بہت بے دردی سے لوٹا گیا اور قلعے کو تڑوا کے زمین کے برابر کرا دیا گیا! (دیکھو مارشمین کی تاریخ ہند (ملخص) صفحہ ۳۵۶۔ اور کس ہیں ۶۵۳ وغیرہ۔

کامیاب نہیں رہا لیکن غالباً خاندانی وجاہت اور خود بن ٹنگ کے اصرار سے نظمائے کمپنی نے اسے گورنر جنرل بنانا منظور کر لیا اور وہ ماہِ جولائی ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) میں دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا؛

بن ٹنگ کے اکثر ہندوستانی اہل الرائے اور سنجیدہ انگریز مورخ مدّاح ہیں اور اسے اہل ہند کا بہی خواہ اور محسن سمجھتے ہیں لیکن بعض انگریز مصنفوں نے اسکی مذمت کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انگریز ماتحتوں میں بھی وہ بہت غیر ہر دلعزیز تھا۔ اس ناراضی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ شوقِ جنگ و ملک گیری سے خالی تھا اور نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے سے بالعموم احتراز کرتا رہا لیکن ایک اور سبب جس نے اس کے ماتحت انگریز عہدہ داروں کو ناراض کیا یہ تھا کہ بن ٹنگ نے انکی آمدنی کے بعض ذرایع (فوجی بھتہ وغیرہ) کم کر دیئے اور ان کے کام پر سختی سے نگرانی قائم کی؛

مگر یہ مالی اصلاحات یا کفایت شعاری درحقیقت نظمائے کمپنی کی ہدایت کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی جن کو جنگ برما نے پھر زیر بار اور پریشان کر دیا تھا۔ اسی کفایت کے ساتھ بن ٹنگ نے سرکاری مداخل میں بھی مختلف اضافے کیئے۔ خاص کر افیون کے تجارتی اجارے کا معاوضہ بہت بڑھا دیا اور اسی ضمن میں ہندوستانیوں کو کثرت سے سرکاری ملازمتیں دیں۔ سابق میں اکثر انگریز گورنر جنرل اہل ہند کی دیانت و قابلیت کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے لیکن بن ٹنگ کو ذاتی طور پر اس قسم کا تعصب نہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ اہل ہند کو ملازمت دینا عین دوراندیشی اور کفایت شعاری جانتا تھا کیونکہ دیسیوں کو اتنی کم تنخواہ دی جاتی تھی کہ اس مشاہرے پر اتنے کارگزار انگریزوں کا ملنا محال تھا؛

نئے مقبوضات — عدم مداخلت کی حکمت عملی پسند کرنے کے باوجود بن ٹنگ کے زمانہ میں بھی کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا یعنی مختلف وجوہ سے مشرقی بنگالے کی دو چھوٹی ریاستوں میں کمپنی کی عملداری قائم کر دی گئی اور اسیطرح کورگ پر فوج بھیجکر اس ریاست کا الحاق کر لیا گیا (۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء) کہتے ہیں کہ یہاں کا راجہ نہایت ظالم خونخوار تھا اور انگریزوں سے سخت عداوت رکھتا تھا

جب فہمائش سے کام نہ چلا اور لڑائی میں یہ راجہ گرفتار ہوا تو اُس کے خاندان میں اور کوئی مرد نہ تھا جسے جانشین بنایا جاتا۔ لہذا یہ ریاست ضبط کر لی گئی ۔

ستی اور ٹھگی کا انسداد

لیکن ولیم بن ٹنک کا سب سے مشہور کارنامہ ستی کا انسداد ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ رسم بہت قدیم سے جاری تھی۔ اکبر نے اپنے عہد بادشاہی میں اُسے روکنے کی کوشش کی اور یہ قانون بنا دیا تھا کہ کسی بیوہ کو ستی ہونے پر مجبور نہ کیا جائے مگر اکبر یا دوسرے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کی مذہبی رسوم میں مداخلت کرنا اصولِ حکومت کے خلاف جانتے تھے لہذا اگر کوئی بیوہ اپنے مُردہ شوہر کے ساتھ خوشی سے جلنا چاہے تو اسے نہ روکا جاتا تھا اور کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ خوف انگیز رسم جاری رہی بعض انگریز حکام کو اس کے انسداد کا خیال آیا بھی تو وہ عملاً کچھ نہ کر سکے اور ہندوؤں کی ناراضی کے اندیشے سے خاموش رہے۔ خود لارڈ ولیم بن ٹنک کو عرصے تک اس قسم کا انسدادی قانون بنانے میں تامل رہا اور اُس نے خاص طور پر ہندو سپاہیوں کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر جب انگریز افسروں نے اُسے اطمینان دلایا کہ ہندو سپاہیوں کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں اور اسیطرح دوسرے عہدہ داروں نے گورنر جنرل کے خیال کی تائید کی تو اس نے وہ "آئین" (یا ریگولیشن) جاری کیا جو "آئینِ ہفدہم مجریہ ۱۸۲۹ء" کے نام سے مشہور رہے۔ اس کی رُو سے بیوہ عورتوں کو جلانا یا زندہ دفن کرنا جُرم اور سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا۔ اور اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جو لوگ اس کام میں شریک ہوں گے وہ "مردم کشی" اور بعض صورتوں میں "قتلِ انسان" کے مجرم سمجھے جائیں گے۔

یہ قانون اوّل اوّل احاطۂ بنگال میں نافذ ہوا تھا بعد میں مدراس و بمبئی کی مقامی حکومتوں نے اور پھر بعض دیسی ریاستوں نے بھی اسی کو خفیف ترمیم و تغیر کے ساتھ اپنے علاقوں میں جاری کر دیا اور رفتہ رفتہ ستی کی رسم ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ غیر آباد مقامات میں یا در پردہ اس قسم کی کارروائی ہوتی رہی ہو تو وہ کسی شمار میں نہیں کیونکہ ستی یا ستی کی طرح دوسری خوفناک رسموں کی بعض مثالیں اب تک کبھی کبھی سننے میں آتی ہیں ۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد کا ایک اور کارنامہ "ٹھگی" کا انسداد ہے۔ جس کے متعلق انگریزوں میں عجیب عجیب افسانے مشہور تھے اور ٹھگوں کی قدامت اور ہمہ گیر قوت واثر پر انگریزی میں مستقل کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ کالی یا بھوانی یا درگا دیوی کو پوجتے تھے اور ان کا تمام ہندوستان میں جال پھیلا ہوا تھا۔ ان کے باقاعدہ "جرگے" تھے جن میں لوگوں کو پکڑنے اور گلا گھونٹنے کا کام اس فن کے خاص ماہروں کے سپرد ہوتا تھا اور باقی شرکا میں سے بعض قبر کھودنے اور بعض جاسوسی کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ مگر ٹھگوں کی اصلی شہرت اور کمال "گلا گھونٹنے" ہی میں تھا کہ وہ رہ گیر یا مسافر کے قریب پہنچکر یک بہ یک رومال کا پھندا گلے میں ڈالتے اور آناً واحد میں آدمی کا کام تمام کر دیتے تھے۔ لوگوں کو طرح طرح کے فریب دیکر لوٹنا یا مسافروں کو راستہ بھلا کر اپنے جال میں پھانسنا ٹھگوں کا خاص ہنر تھا اور اس میں شک نہیں کہ وسط ہند میں ٹھگی ایک موروثی پیشہ بن گئی تھی۔ بعض انگریز عہدہ داروں کی تحریک سے ولیم بنٹنگ اس گروہ کے استیصال پر آمادہ ہوا اور اُس نے "انسداد ٹھگی و ڈکیتی" کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قائم کیا جو ہمارے زمانے تک بھی قائم تھا۔ اُسے ایک قسم کی ہنگامی پولس سمجھنا چاہئے جس کا خاص کام ٹھگوں اور ڈکیتوں کا سراغ لگا کر گرفتار کرنا تھا اور اندازہ کیا گیا ہے کہ خود ولیم بنٹنگ کے زمانے میں اس محکمے کی کوشش سے دو ہزار کے قریب ٹھگ پکڑے گئے اور انھیں قید یا پھانسی کی سزائیں ملیں[1]۔

زبان شاہی کی تجدید

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کا اجارہ ۱۸۱۳ء میں منسوخ ہو چکا تھا لیکن عام تجارت و حکومت کی جو اجازت ملی اس کی میعاد بھی صرف بیس سال رکھی گئی تھی اور وہ ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں ختم ہوئی۔ لہٰذا اس سال انگلستان میں بہت بحث و مباحثہ کے بعد بیس سال کے واسطے پھر مذکورہ بالا حقوق کی تجدید کی گئی اور چونکہ اس مرتبہ چین کی تجارت کا اجارہ بھی منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا اب کمپنی کی حیثیت تاجر کے بجائے مستاجر کی سی رہ گئی جسے خاص خاص شرائط کے ساتھ ملکی مقبوضات میں حکومت کا

[1] مارشمن جلد (ملخص) صفحہ ۴۷۷

حق دیدیا گیا تھا مگر فرمان شاہی کی اس تجدید کے موقع پر اصولِ حکومت میں چند قابلِ ذکر تبدیلیاں ہوئیں اور اول تو گورنر جنرل کے اختیارات دوسرے صوبوں پر بڑھا دیئے گئے دوسرے اُسے ممالک ہند کیلئے قوانین بنانے کا بھی حق دیا گیا جو پہلے حاصل نہ تھا۔ اسی ضمن میں گورنر جنرل کی کونسل میں شعبۂ قوانین کے واسطے ایک رُکن (لا ممبر) کا اضافہ ہوا اور اس خدمت پر سب سے اول اس زمانے کا مشہور انگریز انشا پرداز میکالے مقرر ہوا۔

جدید فرمانِ شاہی یا پارلیمنٹ کے اس قانون کی دفعہ ۸۷ بھی بہت مشہور رہے جس میں صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ممالک ہند کا "کوئی باشندہ" محض اختلافِ مذہب و قومیت یا اختلافِ رنگ و زاد و بوم کی وجہ سے کمپنی کی کسی ملازمت یا کسی عہدے سے محروم نہ کیا جائے گا"۔ یہی وہ اصول یا وعدہ ہے جس کی بعد کے شاہی اعلانات میں تصدیق و تجدید ہوتی رہی اور اکثر انھی اعلانات کی بنا پر اہل ہند کے سیاسی سرگروہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا مطالبہ کرتے رہے ہیں :

انگریزی تعلیم کا آغاز

مذکورۂ بالا اصول، اور کاروبارِ حکومت کی روزافزوں ضروریات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کمپنی کی حکومت ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا رواج دینے پر آمادہ ہو گئی تاکہ اسے انگریزی داں ملازم آسانی سے مل سکیں۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم دینے کے بہت سے انگریز اہل الرائے مخالف تھے اور بعض کی یہ رائے تھی کہ اگر انگریزی حکومت اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے تو وہ اسی قدیم طرز کی عربی اور سنسکرت علوم کی تعلیم ہو جس کا ہندوستان میں پہلے سے رواج تھا۔ اس بحث میں جرائد و کتب کے ہزاروں ورق سیاہ ہوے اور انگلستان و ہندوستان میں بڑی بڑی موشگافیاں کی گئیں۔ لیکن یہ درحقیقت بہت کچھ محض نظری مباحث تھے اور قیاسی نتائج نکالنے کی دھن میں اکثر بحث کرنے والے کمپنی کی عملی ضروریات کو بھول جاتے تھے۔ غرض مخالفین کی کچھ پیش نہ گئی اور بن ٹنگ کے عہد ۱۸۳۵ء میں اسی "انگریزی" طرز تعلیم کی بنیاد پڑ گئی جو ہمارے زمانے تک رائج ہے۔ اس کے رواج دینے میں انگریزی حکومت کو سب سے زیادہ مدد پادریوں سے ملی۔ جو اپنے نزدیک مغربی علوم کی ترویج کو دینِ مسیحی کی اشاعت

کا نہایت عمدہ اور یقینی ذریعہ سمجھتے تھے۔

اوک لینڈ

لارڈ ولیم بن ٹنگ ماہ مارچ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۰ء) میں ملازمت سے دستکش ہو کر ولایت چلا گیا اور ایک سال تک سر چارلس مٹکاف نے عہدہ گورنر جنرل کے فرائض انجام دیئے لیکن اخبارات کو آزادی دینے کی بدولت نظمائے کمپنی اُس سے ناخوش ہو گئے اور اس کے استعفا دینے پر انھوں نے لارڈ اوک لینڈ کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا (مارچ ۱۸۳۶ء ۱۲۵۱ء) جو انگلستان کے اُمرا میں بہت اعتدال پسند اور معاملہ فہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ مگر جنگِ افغانستان کی ناکامی کے باعث بعد میں نہایت بدنام ہوا۔ وہ اب تک بعض انگریز مورخ اس کو ہجو کرتے ہیں[1]

معاملات افغانستان

لیکن انصاف سے دیکھئے تو لارڈ اوک لینڈ یا ہندوستان کے انگریز حکام افغانستان کے معاملات میں مداخلت اور جنگ کے اتنے ذمہ دار نہیں جس قدر کہ انگلستان کی حکومت جو وسط ایشیا میں روس کا روز افزوں اقتدار دیکھ دیکھ کر بہت خائف ہو گئی تھی چنانچہ وزیر خارجہ کی طرف سے (نظمائے کمپنی کی معرفت) لارڈ اوک لینڈ کو ہندوستان پہنچتے ہی تحریک ہوئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے وہ روسیوں کو دربارِ کابل میں رسوخ نہ حاصل کرنے دے اور نیز ایرانیوں کو جو ان دنوں روس کے حلیف ہو گئے تھے ہرات پر قبضہ کرنے سے تا امکان روکنے کی کوشش کرے۔

ان ہدایات کی بنا پر بعض انگریز مصنفوں نے انگلستان کے وزیر خارجہ (لارڈ پامرسٹن) پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ شاید وہ اتنا جغرافیہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہرات و ستلج کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کی درازی کا صحیح اندازہ کر لیتا۔ اسی طرح انھوں نے اوک لینڈ کو ان ہدایات کی تعمیل پر بہت کچھ برا بھلا کہا ہے اور لکھا ہے کہ اگر واقعی روسیوں کا اثر ہرات و کابل تک پہنچ جاتا تو بھی کمپنی کے مقبوضات کی سرحد اُن دنوں ستلج سے آگے نہ بڑھی تھی اور اس سے اور افغانستان کے درمیان ایک طرف پنجاب اور دوسری طرف "امیرانِ سندھ" کی آزاد ریاستیں حائل تھیں۔ نظر بر ایں روسیوں کی سیاسی پیشقدمی سے خوف زدہ ہو کر کابل کے معاملات میں دخل دینا خواہ مخواہ اپنے آپ کوئی دشواریوں

---

[1] مثلاً دیکھو اوکس بس صفحہ ۸۳ و ۲، ۶؛ مارشمین ۳۸۰ وغیرہ۔

پھنسانا تھا۔[ا]

امیرانِ سندھ کے ساتھ انگریزوں کے سیاسی تعلقات کا ذکر ہم آگے پڑھیں گے لیکن اس جگہ یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۰۹ء (۱۲۲۳ھ) ہی میں جب بارک زئی قبیلے کے سرداروں نے احمد شاہ درانی کے جانشین پوتے شاہ شجاع کو لڑ کر کابل سے نکالا تو اس نے انگریزوں کی پناہ لی تھی۔ کمپنی کی شمالی سرحد کی سب سے بڑی چھاؤنی اس وقت لودھیانہ میں تھی یہیں شاہ شجاع کو ٹھیرایا گیا اور وہ برابر اپنی میراث حاصل کرنے کے جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا۔ اس نے دو مرتبہ سکھوں کی مدد اور انگریزوں کی تائید، یا کم سے کم اجازت سے کابل پر فوج کشی بھی کی لیکن دونوں مرتبہ ناکام ہوا البتہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکومتِ کابل کی اسی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا تھا اور دوست محمد خاں کے بھائی سلطان محمد کو ملا کر، پشاور پر قبضہ کرلیا تھا۔ دوست محمد خاں بارک زئی قبیلے کا وہ سردار ہے جو شاہ شجاع کے اخراج کے بعد آخر میں (۱۸۲۶ء ۱۲۴۱ھ) افغانستان کا بادشاہ ہوگیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ سکھوں سے پشاور چھین لیا تھا لیکن رنجیت سنگھ کی پوری قوت اور فوجِ کثیر کے سامنے سے دوبارہ ہٹنا پڑا اور اب وہ از سرِ نو سکھوں پر ایک مذہبی جہاد کی منادی اور تیاریاں کر رہا تھا اور سلطنتِ روس بھی وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کی اس جہاد میں شرکت کرنے کی موید نظر آتی تھی![۲]

جنگِ افغانستان

مذکورۂ بالا اسباب نے اگر انگلستان کے وزرا کو اندیشہ مند کر دیا تو اُن کے خطرے بے بنیاد نہ تھے اور خود آوک لینڈ کا یہ منصوبہ کہ روسی خطرے کے انسداد کی بہترین صورت یہ ہے کہ افغانستان میں شاہ شجاع کو بادشاہ بنا دیا جائے، یہ کچھ بھی قابلِ حیرت یا "لائقِ ضحکہ" نہیں معلوم ہوتا۔ شاہ شجاع سے کمپنی کے پہلے ہی روابط قایم ہو گئے تھے اور دوست محمد یا کسی دوسرے افغان سردار سے انگریزوں کی دوستداری کی اتنی اُمید نہ ہو سکتی تھی جتنی شاہِ شجاع سے تھی۔ چنانچہ دوست محمد خاں سے سیاسی

[ا] مثلاً دیکھو اوڈس صفحہ ۸۴، ۹۱ وغیرہ۔ اِنز کی "شارٹ ہسٹری اوف دی برٹش انڈیا"، صفحہ ۲۳۸ و ۲۳۹۔

[۲] اِنز صفحہ ۲۳۳؛ مارش مین (ملخص) صفحہ ۲۸۹ و ۳۰۰

تعلقات قائم کرنے کے لیئے جو انگریزی سفارت کابل بھیجی گئی تھی وہ بھی ۱۸۳۹ء (۱۲۵۳ھ) میں ناکام واپس چلی آئی۔ دوست محمد خاں دوستی کے معاوضے میں چاہتا تھا کہ انگریز اپنے حلیف مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پشاور اُسے واپس دلوا دیں۔ لیکن انگریزی سفیر صرف یہ اقرار کرتا تھا کہ سکھ خیبر سے آگے نہ بڑھیں گے۔ حالانکہ یہ اقرار بالکل غیر ضروری اور مفت کرم داشتن کے مصداق تھا کیونکہ سکھوں کو پشاور پر قبضہ رکھنا ہی وبال ہو گیا تھا۔ آگے بڑھنے کی اُن میں ہمت نہ تھی۔[1]

بہر حال اوک لینڈ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیئے افغانستان سے آمادہ جنگ ہو گیا۔ بعض انگریز اہل الرائے اس کی تجویزوں سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اُس نے اُن کی نصیحت نہ مانی اور شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک "اتحاد ثلاثہ" قائم کر کے دوست محمد خاں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ (اکتوبر ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۵۴ھ)

فیروز پور (پنجاب) کے جنگی مرکز سے ایک زبردست فوج درہ بولان کے راستے افغانستان پہنچی گئی اور اس کی مدد کے لیئے ایک دوسری انگریزی فوج ملک سندھ کے راستے بڑھی کہ قندھار پر شمالی فوج سے جا ملے۔ قریب قریب اس بات کا تمام انگریزی تاریخوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ملک سندھ سے انگریزی فوجوں کا لیجانا اس عہد و پیماں کی صریح خلاف ورزی تھی جو اسی زمانے میں بار بار امیران سندھ کے ساتھ کیئے گئے تھے لیکن اوک لینڈ نے "ضرورت وقتی" کے لیئے اس کھلی ہوئی بدعہدی کو جائز قرار دیا اور بمبئی کی امدادی افواج نہ صرف سندھ سے گزریں بلکہ انھوں نے امیرانِ سندھ سے جبراً بہت سا روپیہ وصول کیا اور اُن سے زبردستی ایک نئے معاہدے پر دستخط لیئے جس نے ان امیروں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔[2]

---

[1] رنجیت سنگھ نے پشاور کی جنگی حفاظت اپنے ایک فرنگی سردار اوی تابیل کے سپرد کی تھی اور اُس کا یہ قول محفوظ ہے کہ خیبر سے آگے بڑھنا درکنار سکھ سپاہیوں کو صرف خیبر کے نام سے ہول ہوجاتا تھا (مارشن میں صفحہ ۲۹)

[2] ونسنٹ اسمتھ نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بجنسہ ترجمہ کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

"بمبئی کی امدادی فوج کی پیشقدمی میں ۱۸۳۲ء کے معاہدوں کی صریح خلاف ورزی مضمر تھی۔ مگر لارڈ اوک لینڈ نے

اپریل ۱۸۳۹ء (اواخر ۱۲۵۴ھ) میں انگریزی فوجیں شاہ شجاع کو لیئے ہوئے قندھار پہنچ گئیں۔ پہاڑی راستے اور سردی کے موسم سے سفر میں کافی مصائب و نقصانات اٹھانے پڑے لیکن دشمن سے کوئی مقابلہ نہیں ہوا اور معمولی مزاحمت کے بعد قلعۂ غزنی بھی قبضے میں آگیا۔ دوست محمد خاں نے یہ خبر سن کر کابل کو خالی کر دیا اور ماہ اگست ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) میں شاہ شجاع اور اس کے انگریز حلیف بلا دقت پائے تخت کابل پر قابض ہو گئے؛

شاہ شجاع کو افغانستان میں پہنچانے اور دوبارہ بادشاہ بنادینے کے بعد معاہدات اور نیز مصلحت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ انگریزی فوجوں کو واپس بلالیا جائے لیکن اول تو شاہ شجاع کے طاقتور حریفوں کے اندیشے سے اور پھر ایران و روس کی رقابت کے جوش میں واپسی کو ملتوی کر دیا گیا اور جس قدر زیادہ دیر تک انگریز افغانستان میں ٹھیرے اسیقدر زیادہ وہاں کے مقامی جھگڑوں میں الجھ گئے۔ اور اتنے عرصے میں افغانوں کو عام طور پر یہ یقین ہو گیا کہ شاہ شجاع کی امداد محض حیلہ ہے بلکہ خود انگریز ملکِ افغانستان پر تسلط کرنا چاہتے ہیں؛

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۴) اپنے سکرٹری (میک ناٹن) کی معرفت کالی دیدہ دلیری سے حیدرآباد (سندھ) کے ریزیڈنٹ کو حکم دیا کہ "تم سندھ کے امیروں کو اطلاع دے دو کہ جب تک ہماری موجودہ ضرورتیں باقی رہیں گی، اس وقت تک معاہدے کی وہ دفعہ جس میں دریائے سندھ کی راہ جنگی ساز و سامان بھیجنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لازمی طور پر معطل رکھی جائیں گی تا آنکہ وہ مہم سر ہو جائے جو خود اسی معاہدے کے کرنیوالوں کی دوامی حفاظت کے واسطے (کابل) روانہ کی گئی ہے"

"اسی طرح واثق عہد و پیماں کے خلاف، شکارپور، بھکر اور سندھ کے کئی اور مقامات پر انگریزی فوج نے قبضہ بھی کر لیا خود امیروں پر انگریزوں سے عداوت اور عہد شکنی کے الزامات وارد کیئے گئے جو محض لا یعنی تھے پھر ان سے فروری ۱۸۳۹ء میں ایک نام نہاد معاہدے پر جبراً دستخط لیئے گئے جس نے ان کی آزادی کو فنا کر دیا انہیں ایک امدادی فوج رکھنے اور اسکے لیئے تین لاکھ روپیہ سالانہ دینے اور اپنے ہاں کمپنی کا سکہ چلانے پر مجبور کیا گیا اور طرح طرح سے ان سے روپیہ وصول کیا گیا اور بہت سی زیادتیاں ہوئیں مگر اس ناخوشگوار مضمون کو مزید طول دینا بیکار ہوگا۔ (ادکس ہس صفحہ ۱۷۸)

یہاں اتنی صراحت اور کر دینی چاہیئے کہ انگریزوں کی شمالی فوج کا سیدھا راستہ بھی پنجاب سے گزرتا تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے گوارا نہ کیا اور اس پر زور نہ چل سکتا تھا کہ سندھ کی طرح پنجاب کے مقامات پر بھی "ہنگامی ضرورتاً" کی خاطر قبضہ کر لیا جاتا۔

بعض انگریز عہدہ داروں کی بدچلنی سے بھی[۵۱] اہل کابل کو سخت اشتعال پیدا ہوا اور ادھر سال بھر کے بعد انگریزوں نے افغانی قبائل کو وہ روپیہ دینا موقوف کردیا جسے یہ قبائل اپنی غیر جانب داری کا واجبی معاوضہ سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۴۰ئہ (اواخر سنہ ۱۲۵۶ئہ) میں جابجا انگریزوں کے خلاف شورشیں بپا ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ اس شورش نے ایک ایسی قومی جنگ کی صورت اختیار کرلی جس سے ممالک ایشیا میں اہل یورپ کو غالباً پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا نظمائے کمپنی کو ولایت میں ان حالات کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہوگئے اور انھوں نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی ناکامیابی کو تسلیم کرلیں اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلے آئیں، مگر آوک لینڈ[۵۲] نے ان کی صلاح نہ مانی۔ اور اس کے کابل میں ٹھیرے رہنے کے ارادے کو غالباً سب سے زیادہ تقویت اس بات سے پہنچی کہ امیر دوست محمد خاں نے کچھ عرصے تک ادھر ادھر بھرنے اور چند لڑائیاں لڑنے کے بعد اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیا (نومبر سنہ ۱۸۴۰ئہ) انگریزوں نے اس کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا اور کلکتہ بھیجکر دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کردیا

انگریزی فوج کی تباہی

لیکن دوست محمد خاں کی مصالحت یا اطاعت سے افغانوں کی عداوت میں کوئی کمی نہ آئی اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف شورش و جنگ کا بازار گرم ہوگیا۔ انگریزی فوجوں نے اس مخالفت کو جتنا زور شمشیر فرو کرنا چاہا اسی قدر اہل افغانستان کی ناراضی بڑھتی گئی اور بچہ بچہ انگریزوں کا دشمن ہوگیا۔ انگریزی فوج کی کل تعداد جو اس وقت افغانستان میں مقیم تھی پچیس ہزار کے قریب بتائی گئی ہے[۵۳]۔ اس کا سب سے بڑا حصہ خاص پائے تخت کابل میں فروکش تھا اور آٹھ دس ہزار سپاہی غزنی، جلال آباد، قندھار وغیرہ مرکزی قلعوں میں متعین کردیئے گئے تھے۔ ابتدا میں سب سے زیادہ تکلیف اور پریشانی انھی بیرونی فوجوں کو پیش آئی اور اپنے اپنے قلعوں میں ان کی حالت محصورین کی سی ہوگئی۔ لیکن رفتہ رفتہ دشمن کی سب سے بڑی تعداد نے کابل کو گھیر لیا اور اسی شہر کے قریب ایک بڑے معرکے میں انگریزی

---

۵۱ اوکس ہس صفحہ ۶۸۰۔ مارشمن جین صفحہ ۲۰۴۔

۵۲ اوکس ہس صفحہ ۶۸۰

۵۳ مارشمن جین صفحہ ۲۰۶

فوج کو سخت شکست ہوئی اور وہ بہ مشکل بھاگ کر اپنے مورچوں تک سلامت پہنچ سکی[1] (نومبر ۱۸۴۱ء مطابق ۱۲۵۷ھ)

اس واقعے نے افغانوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور انگریزی فوج کے سپاہیوں کی ہمت کو اور بھی پست کر دیا۔ انھیں چھاؤنی سے نکلکر شہر تک جانا دشوار ہوگیا اور خود اہل شہر کی عداوت نے انگریزی لشکرگاہ میں اجناس خوردنی کا قحط ڈال دیا۔ اس وقت دشمن کے جتھے میں دوست محمد خاں کے فرزند محمد اکبر خاں کے آجانے سے انگریزوں کو ایک حد تک ڈھارس ہوئی کیونکہ یہ نوجوان سردار مصالحت پر آمادہ تھا اور اکثر افغانی قبائل کے لوگ بھی اس کے مطیع اور فرماں بردار تھے، الغرض انگریز سپہ سالاروں کو صلح کر لینا ہی بہت غنیمت معلوم ہوا جس کی شرطیں یہ تھیں کہ جلال آباد، کابل، قندھار و غزنی کو انگریزی فوجیں فوراً خالی کر دیں گی۔ دوست محمد خاں اور اس کے خاندان کو واپس کابل بھیجدیا جائے گا اور شاہ شجاع بادشاہی کے دعوی سے دست بردار ہو جائے گا مگر اس کو اجازت ہوگی کہ خواہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان چلا جائے خواہ وظیفہ لے کر کابل میں رہے[2]۔

لیکن ادھر تو قابو یافتہ افغان بعض نئے مطالبات پیش کر رہے تھے کہ انھیں غزنی اور جلال آباد وغیرہ کے تخلیے کا اطمینان ہو جائے اور ادھر انگریز سفیر میک ناٹن بعض افغانی قبائل سے دربردہ سلسلہ جنبانی کر رہا تھا کہ اگر وہ شاہ شجاع کی رفاقت پر آمادہ ہوں تو مذکورۂ بالا صلح کو منسوخ کر دیا جائے[3] لیکن اس کوشش میں کوئی کامیابی کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی کہ محمد اکبر خاں نے ملاقات کے حیلے سے میک ناٹن کو بلا کر قتل کر دیا اور انگریز سرداروں کو افغانوں کے تازہ مطالبات بھی طوعاً وکرہاً تسلیم کرنے پڑے یعنی چند پرغمال اور چھ توپوں کے سوا، پورا توپ خانہ، تمام بندوقیں، اور گولہ بارود افغانوں کے حوالے کر کے وہ جنوری ۱۸۴۲ء (۱۲۵۷ھ) میں کابل سے پشاور روانہ ہوگئے، اس وقت انگریزی فوج کی تعداد پانچ ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی اور اسی کے ساتھ

---

[1] مارشمین صفحہ ۴۱۱

[2] مارشمین۔ ۴۱۲

[3] مارشمین۔ ۴۱۴

گیارہ بارہ ہزار بہیر کے آدمی تھے۔ اپنے تمام مطالبات تسلیم کرا لینے کے بعد، بظاہر اکبر خاں اور اس کے بارک زئی سردار بھی اس شکستہ دل انگریزی فوج کی واپسی میں کوئی خاص رکاوٹ ڈالنی نہ چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے سارے ملک کو اپنا دشمن بنا لیا تھا اور ان میں سب سے زیادہ خونخوار غلزئی قبائل کے لوگ تھے جن کے ساتھ انگریزوں نے ابتدا میں کسی قدر بدسلوکی کی تھی۔[1] ان بے رحم و بے وفا قبائل کو انتقام کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ انھوں نے کابل سے تھوڑے ہی فاصلے پر خورد کابل کے تنگ درّے میں انگریزی فوج پر حملہ کیا جس میں ہزاروں سپاہی اور ساتھ کے آدمی مارے گئے مختصر یہ کہ چند ہی منزل کے سفر میں انگریزی سپاہ کو برف باری، فاقہ کشی اور ان پیہم حملوں نے بالکل تباہ کر دیا اور ان عورتوں بچوں یا انگریز سرداروں کے سوا، جو بطور یرغمال اکبر خاں کے حوالے کر دیئے گئے تھے، ساری فوج ہلاک ہو گئی فقط ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن زندہ بچ کر جلال آباد پہنچ سکا جس نے اس خوفناک تباہی کی اطّلاع دی۔

تلافی کی تدابیر

مذکورۂ بالا نقصانات کی خبروں نے ہندوستان اور انگلستان میں ہلکہ سا ڈال دیا۔ بے شبہ کابل میں شکست اور اس آخری مصیبت کا ایک بڑا سبب وہاں کے انگریز سپہ سالاروں کی نا اہلی اور باہمی نا اتفاقی تھی لیکن اکثر انگریز اہل الرائے اس تمام خرابی کا ذمہ دار لارڈ آکلینڈ کو قرار دیتے تھے جس نے فتحِ کابل کا "مجنونانہ منصوبہ" سوچا تھا۔ چنانچہ اس کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور فروری ۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلن برو اس کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا جس نے سب سے پہلے کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے گزشتہ ہزیمت کی تلافی کی جائے۔

واضح رہے کہ کابل میں انگریزی فوج کی شکست اور مذکورۂ بالا شرائط صلح قبول کرنے کے باوجود، جلال آباد و غزنی وغیرہ مقامات کی انگریزی فوجوں نے اپنے قلعے خالی نہیں کیئے تھے۔ چند روز بعد غزنی کے انگریز سپہ سالار کو ہتھیار رکھ دینے پڑے۔ لیکن جلال آباد، قندھار، اور قلات غلزئی کی متعینہ افواج برابر مدافعت کرتی رہیں اور النبرو نے سب سے پہلے انھی کو کمک بھیجکر دشمن کے محاصرے سے نجات دلائی۔

[1] مارشمین صفحہ ۷۰۴

یہ گورنر جنرل امدادی فوج کی مزید پیشقدمی سے اندیشہ مند تھا لیکن اس تازہ دم لشکر کو جو کافی سازوسامان کے ساتھ ہندوستان سے بھیجا گیا، پولک اور ناٹ جیسے پرجوش سپہ سالار ملے تھے۔ وہ اپنی ذمہ داری پر غزنی اور کابل تک بڑھے اور اہل افغانستان کی دشمنی کی سزا میں شہر غزنی کو جلا کر مسمار کرا دیا۔ افغانوں کی طرف سے ان کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی اور کابل تک پہنچ کر انگریزی فوجیں اس "بھڑوں کے چھتے" کی حدود سے واپس پشاور چلی آئیں (نومبر ۱۸۴۲ء)[1] کمپنی کی طرف سے لارڈ النبرو نے گذشتہ غلطی (یعنی افغانستان پر فوج کشی) کا اعتراف کیا اور دوست محمد خاں کو دوبارہ اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی، جہاں وہ اپنی طویل زندگی کے باقی ایام میں بلا خرخشہ حکومت کرتا رہا۔[2]

الحاق سندھ

اگرچہ لارڈ النبرو متعدد تحریروں میں اپنی صلح پسندی کا گویا ببانگ دہل، اعلان کرتا رہا تھا اور اسی زمانے میں ایک "تمغائے امن وصلح" بھی اس نے ضرب کرایا تھا[3] لیکن ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ملک سندھ پر قبضہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ چنانچہ "لارڈ اوک لینڈ نے تو صرف دیدہ دلیری سے امیران سندھ کے ساتھ بدعہدی کی تھی النبرو نے اس سے بھی بڑھکر یہ کام کیا کہ عمداً انہیں جنگ کا اشتعال دلایا تاکہ اس ملک کا الحاق کیا جا سکے۔۔۔"[4]

سندھ کے یہ "امیر" یا "میر"، تالپور خاندان کے بلوچی سردار تھے اور ان کی تین شاخیں ہو گئی تھیں۔ ایک شاخ یا خاندان شمالی سندھ میں حکومت کرتا تھا، اور اس کا صدر مقام خیرپور تھا، شکارپور، بھکر وغیرہ بارونق تجارتی شہر اس کے علاقے میں تھے۔ دوسرا خاندان سندھ کے مشرقی اضلاع کا، اور تیسرا سندھ کے وسطی اور جنوبی علاقوں کا حاکم

---

[1] اس واپسی کے متعلق مارشمین لکھتا ہے کہ "اہم کا مقصد پورا ہو گیا یعنی افغانستان کو ہم نے دوبارہ فتح کر لیا۔ اپنے قیدی چھڑا لیے اور ہماری جنگی شہرت میں پھر وہی آب و تاب آگئی! بایں ہمہ (واپس ہوتے وقت) پائے تخت کابل میں اپنے انتقام کی یادگار چھوڑنی ضرور تھی۔ لہٰذا وہاں کے بڑے مسقف بازار کو جس میں انگریزی سفیر (سر ولیم میک ناٹن) کی نعش کی تشہیر کی گئی تھی اور جو وسط ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے شاندار عمارت تھا، سرنگ لگا کے اڑا دیا" (صفحہ ۴۲۹)

[2] مارشمین صفحہ ۴۳۱۔

[3] اسمتھ صفحہ ۶۴۴۔

[4] اکسفرڈ ہسٹری " ۶۴۴ -

تھا۔ اس تیسری شاخ کا پایۂ تخت حیدرآباد (سندھ) اور جنگی قوت و اقتدار سب سے زیادہ تھا لیکن آپس میں ان امیرانِ سندھ کے درمیان کیسے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں، بیرونی حریف کے مقابلے میں وہ ایک ہو جاتے تھے اور کم سے کم اس بارے میں سندھ کے تمام اہل الرائے متفق تھے کہ جہاں تک ہو سکے سندھ میں انگریزوں کو کسی قسم کی مداخلت کا موقع نہ دیا جائے، حتیٰ کہ وہ کمپنی کے ساتھ کوئی تجارتی تعلق بھی رکھنا نہ چاہتے تھے اور جب تجارتی معاہدات کرنے پر بہت مجبور کیا گیا تو اس وقت بھی انھوں نے ہر عہد نامے میں خاص طور پر صراحت کے ساتھ یہ شرط لکھوائی کہ فریقین ایک دوسرے کے ملکی مقبوضات پر لالچ کی نظر تک نہ ڈالیں گے"[1] بایں ہمہ جنگ افغانستان کے موقع پر سندھ کے بعض مقامات پر جس طرح زبردستی قبضہ کیا گیا اور خراج گزاری کے اقرار لیے گئے ان کا اجمالاً ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اب الن برو نے سر چارلس نے پیر کو کمپنی کا نمائندہ بنا کر سندھ روانہ کیا جو اس ملک کا الحاق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ اُس نے اہلِ سندھ کو اس قدر دق کیا کہ بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد بلوچیوں نے بگڑ کر کرنل اوٹ رم کی قیام گاہ پر حملہ کیا۔ اسی مفسدے سے نے پیر کو حسب دلخواہ حیلہ مل گیا اور اُس نے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔[2] (فروری ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ)

کمپنی کی قواعد داں افواج اور توپ و تفنگ کا مقابلہ کرنے کی امیرانِ سندھ میں قوت نہ تھی دو ہی لڑائیوں میں ان کا شیرازہ بکھر گیا اور پھر چند روز کی تگ و دو میں وہ قبول اطاعت پر مجبور ہو گئے مگر نے پیر نے ان "امیروں" کو جلاوطن کر کے سندھ کے الحاق کا اعلان کر دیا اور سوائے ریاست خیر پور کے، جہاں کا رئیس لڑائی میں انگریزوں کا معاون رہا تھا، یہ تمام علاقہ براہِ راست کمپنی کے زیرِ نگیں آ گیا۔

الن برو کی بازطلبی

الن برو کے مختصر عہدِ حکومت کے دو واقعے اور قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اُس نے دو لڑائیوں یعنی جنگ مہاراج پور و پنیار میں ریاست گوالیار کی جنگی قوت توڑ دی جو وہاں کی بیوہ رانی تارا بائی اور اس کے متبنی بیٹے کے صغرسنی اور گوالیار کے سرداروں کی نااتفاقی

---

[1] اوکس ہس صفحہ ۶۶۱

[2] اوکس ہس صفحہ ۶۸۵

سے بہت اندیشہ ناک نظر آنے لگی تھی[1] دوسرے اسی سال (۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹-۶۰ھ) الن برو نے بردہ فروشی کو خلاف قانون قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی شخص کمپنی کے علاقے میں "غلام" نہیں بنایا جا سکے گا۔ اسی زمانے میں بنگال و مدراس کی ہندوستانی افواج میں شورش ہوئی اور نظمائے کمپنی نے جو الن برو کی نمائش پسندی اور خود داری سے پہلے ہی سخت شاکی تھے، اُسے واپس بلا لیا (جولائی ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۶۰ھ)

۲۔ جنگ ہائے پنجاب اور نئے مقبوضات

لارڈ ہارڈنگ (اوّل)

الن برو کا جانشین۔ سر ہنری ہارڈنگ جسے بعد میں "لارڈ" کا خطاب حاصل ہوا، انگلستان کے نامی گرامی شرفا میں۔ یورپ کی کئی لڑائیوں میں اس نے سپہ گری کے جوہر دکھائے اور زخم کھائے تھے۔ سالہا سال تک وہ پارلیمنٹ کا رکن اور ایک مرتبہ وزارتِ جنگ کے معزز عہدے پر ممتاز رہ چکا تھا اور اگرچہ ہندوستان آنے کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن سپاہیانہ جوش اور جفاکشی میں زیادہ فرق نہ آیا تھا اور اس کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے اندرونی انتظامات میں تازہ قوت پیدا ہو گئی لارڈ ہارڈنگ کے اوائل عہد میں دختر کشی اور انسانی قربانی یا بھینٹ کی قبیح رسموں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاری تھیں سختی سے انسداد کیا گیا۔ ریلوں کے اجرا اور نہر کاری کے نقشے تیار ہوئے لیکن اس گورنر جنرل کا اصلی اور مشہور کارنامہ "پہلی جنگ پنجاب" ہے جس میں سکھوں کی قوت ٹوٹی اور ملک پنجاب میں انگریزوں کا اثر قائم ہو گیا۔

جنگ پنجاب

عام انگریزی روایات کے بموجب اس جنگ کی ابتدا سکھوں کی طرف سے ہوئی جن کی فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۵ھ) کے بعد حکومت کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ خود حکومت (پنجاب) کی کمزوری اور ابتری اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ گذشتہ چھ برس کے اندر چار شخص گدّی پر بیٹھے اور چاروں خونیوں کے ہاتھ سے مارے گئے اور اب یعنی جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں (۱۸۴۵ء) جو پانچواں حاکم "شیر پنجاب" کا جانشین ہوا اوّل تو اس کا نسب ہی درست نہ تھا دوسرے اس کی عمر پانچ سات سال سے زیادہ نہ تھی اور اس کی طرف سے رانی جنداں اتالیق کی حیثیت سے حکومت کرتی تھی

[1] مذکورہ بالا لڑائیوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد رانی کو وظیفہ دیکر معاملات ملکی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ راجہ کی نابالغی تک تمام اختیارات انگریز ریذیڈنٹ کے تفویض ہوئے اور ریاست کی فوج گھٹا کر وہاں انگریزی کنٹن جنٹ کی تعداد بڑھا دی گئی ہے

یہ رانی بھی کوئی خاص لیاقت یا خاندانی وجاہت نہ رکھتی تھی اور ظاہر تھا کہ سکھوں کی شل شورہ پشت سپاہیوں پر اس کا کوئی حقیقی رعب داب نہ ہو سکتا تھا بلکہ درحقیقت یہ ان سپاہیوں کی عنایت تھی کہ انھوں نے جنداں کے صغیر سن بچے دلیپ سنگھ کو رنجیت سنگھ کا بیٹا اور پنجاب کا حاکم تسلیم کر لیا[۵]۔

اِن سکھ سپاہیوں کی تعداد جنھیں رنجیت سنگھ کی غیر معمولی قابلیت اور سالہا سال کی کوشش نے ایک زبردست فوج کی شکل میں مرتب کر لیا تھا، نوّے ہزار کے قریب بتائی گئی ہے اور اس میں پچاس ہزار سے زیادہ پیادہ فوج کے وہ سپاہی تھے جو جدید ترین اسلحہ سے مسلح اور مغربی قواعدِ جنگ سے بخوبی واقف تھے اور اُن کے فرنگی سرداروں میں کم سے کم دو ایسے تھے جو خاص نپولین بوناپارٹ کی فوجی ملازمت اور تربیت میں رہ چکے تھے۔ اسی طرح سکھوں کے پاس بڑا زبردست توپخانہ تھا اور مجموعی طور پر اُنکی فوجی قوت ایسی اچھی تھی کہ انگریز اُن پر حملہ کرنے میں ہچکچاتے تھے[۱]۔ چنانچہ اس جنگ کی پہلی تین لڑائیاں ستلج کے جنوب (یعنی انگریزی علاقے) میں ہوئیں (دسمبر ۱۸۴۵ء و جنوری ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۱ھ)

آغازِ جنگ کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ سکھوں نے دہلی کی تسخیر و تاراجی کے ارادے سے ستلج کو عبور کیا۔ رانی جنداں اور اس کے مشیروں نے بھی ان سرکش سپاہیوں کے دباؤ سے بچنے کے لئے انھیں انگریزی علاقے پر حملے کی تحریک کی یعنی ان کی تخریب و تباہی کا سامان کیا اور اِن جنگ جو سپاہیوں نے جن کا کوئی دور اندیش سر دھرانہ تھا، اس تجویز کو قبول کر لیا۔ پھر ستلج اتر کے لدھیانہ کے مغرب میں ان کے انگریزی فوج کے ساتھ دو یا تین خونریز معرکے ہوئے (مدکی، فیروز شاہ علی وال کی لڑائیاں) جن میں ابتدائی کامیابی کے بعد آخر میں سکھوں کو شکست ہوئی اور وہ بہت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے۔

لیکن جنگ کا آخری معرکہ ستلج و بیاس کے سنگم کے قریب سبراؤن پر ہوا۔ (فروری ۱۸۴۶ء) جس میں سکھوں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی اور کچھ ان مصائب اور

---

[۵] دلیپ سنگھ کے نسب اور جنداں رانی کے متعلق دیکھو گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" صفحہ ۱۰۹۔ ادرس ص صفحہ ۶۹۳

[۱] ادرس ص صفحہ ۶۹۲

کچھ باہمی نفاق کی وجہ سے پھر وہ انگریزی فوج کو نہ روک سکے جس نے چند روز میں آگے بڑھکر لاہور پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ اسی جگہ یہ شرائط صلح قرار پائیں کہ دوآبہ جالندھر اور تاوان جنگ کے ساتھ کشمیر و ہزارہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور لاہور میں ایک انگریز ریزیڈنٹ۔ اور ختم سال تک انگریزی فوج بھی مقیم رہے گی ؛

لاہور کے قبضے اور ان شرائط کے طے کرنے میں بڑی آسانی اس لئے ہوئی کہ خود دربار لاہور کے بعض سکھ سردار انگریزوں کے رفیق و مددگار ہو گئے حتیٰ کہ انھی کی درخواست پر چند ماہ بعد مذکورۂ بالا معاہدے میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ انگریزی فوج ایک سال کی بجائے آٹھ سال تک لاہور میں مقیم یا قابض رہے گی۔ نیز انگریز ریزیڈنٹ (سر ہنری لارنس) اس انتظامی مجلس کا صدر نشین بنا دیا گیا جو دلیپ سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کرنے کے واسطے مقرر ہوئی تھی اور لارنس کی یہ صدارت کچھ فوجی اقتدار و قوت اور کچھ ذاتی قابلیت کی بدولت ایسی حکومت بن گئی کہ راجہ اور اُس کے سکھ سرداروں کا فقط نام ہی نام رہ گیا ورنہ قریب قریب سارے اختیارات انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں آ گئے۔[۱]

دوسری جنگ کے اسباب

انگریزوں کا یہ تسلط یقیناً پنجاب کے بہت سے سکھوں کو ناگوار ہوا ہو گا جن کی فوج کی تعداد اگرچہ گھٹا دی گئی تھی پھر بھی شمالی اور مغربی اضلاع میں متعدد جیوش جنگی ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ بایں ہمہ اُن کی ناراضی کئی سال تک دبی ہوئی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بظاہر ہر طرف امن و امان ہو گیا تھا۔ کم سے کم جب تک لارڈ ہارڈنگ اپنی میعاد پوری کر کے انگلستان گیا (۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۴ھ) اس وقت تک جنگ و جدال کے کچھ آثار نہ تھے اور ہارڈنگ نے اپنے جانشین (لارڈ ڈلہوزی) کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ سات برس تک ہندوستان میں توپ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

لیکن اوّل تو نیا گورنر جنرل کشورستانی کا بڑا حامی تھا دوسرے ملتان کے سکھ صوبہ دار کی لاہور کے ریزیڈنٹ سے مخالفت اور ابتدائی کامیابی نے بہت سے سکھ سرداروں کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جنگ کر دیا۔ یہ سکھ صوبہ دار مول راج نامی چند سال پہلے اپنے باپ کی جگہ ملتان کا حاکم ہوا تھا۔ اس کے متوفی باپ کی زرستانی

[۱] اوکس ہس صفحہ ۶۹۵

اور دولتمندی سارے پنجاب میں مشہور تھی اور اسی بنا پر لاہور کی حکومت نے مولراج سے سند صوبہ داری کے معاوضے میں ایک کرور روپیہ نذرانے کا مطالبہ کیا۔ مول راج نے اس قدر کثیر روپیہ دینے سے انکار کیا اور آخر میں رانی جنداں اور اس کے مشیر اس رقم کا صرف پانچواں حصہ (بیس لاکھ روپے) لینے پر رضامند ہو گئے تھے کہ اتنے میں انگریزوں سے لڑائی چھڑ گئی اور لاہور میں انگریزی ریزیڈنٹ کا عمل دخل ہو گیا لیکن جب انگریز ریزیڈنٹ نے از سر نو اس معاملے کو اٹھایا اور اندرونی انتظامات میں بھی مولراج کو بعض نئی قیود و ہدایات کا پابند بنانا چاہا تو اس نے تنگ آ کر استعفا دینے کی دھمکی دی۔ ریزیڈنٹ فوراً استعفا قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا بلکہ مولراج کی بجائے اس نے اپنے ایک معتمد علیہ کھان سنگھ کو ملتان کی صوبہ داری پر نامزد کر دیا اور نئے صوبہ دار کے ساتھ دو انگریز ملتان بھیجے گئے کہ کھان سنگھ اُن کے مشورے سے صوبے کا انتظام کرے[1]۔ (مارچ ۱۸۴۸ء)

ان انگریز مشیروں نے جائزہ لیتے وقت حساب فہمی میں مولراج سے بہت سختی کا برتاؤ کیا اور اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ خود مولراج نے ان انگریزوں کو قتل کرنے کی تحریک کی لیکن جب ان انگریزوں کے ساتھ کے سکھ سپاہیوں نے بگڑ کر اپنے انگریز افسروں کو مار ڈالا تو مولراج نے قاتلوں کے اس فعل پر پسندیدگی ظاہر کی اور علانیہ انگریزوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اس کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بنوں اور لاہور سے جو انگریزی فوجیں آئی تھیں وہ خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل کر سکیں اور ان فوجوں کے بہت سے سکھ سپاہی اور سردار مولراج سے مل گئے۔

چلیان والہ اور گجرات کے معرکے

اس بات کے بھی ثبوت پائے گئے کہ بہت سے سکھ سردار در پردہ انگریزی حکومت کے خلاف ساز باز کر رہے ہیں اور انھوں نے پشاور دے کر امیر دوست محمد خاں کو اپنا شریک و مددگار بنا لیا ہے۔ غرض ملتان کے معمولی فساد نے چند ہی مہینے میں بڑھتے بڑھتے ایک بڑی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور ڈلہاوزی نے بڑے طیش و غضب

---

[1] مارش مین صفحہ ۵۰۸۔ ونسنٹ اسمتھ نے کھان سنگھ کا نام ہی اڑا دیا ہے (صفحہ ۶۸۵) اور دیگر روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کھان سنگھ محض برائے نام صوبہ دار تھا اور اصلی اختیارات ان ہی دو انگریزوں میں سے ایک نوجوان عہدہ دار اسٹر اگنیو کے ہاتھ میں دینے مقصود تھے۔

کے ساتھ وسیع پیمانے پر سکھوں کا قلع قمع کرنے کی تیاریاں کیں! نومبر ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں ایک بہت بڑی انگریزی فوج فیروزپور میں جمع ہوئی اور خود انگریزی سپہ سالار (لارڈ گف) اسے لیکر لاہور کے شمال میں بڑھا جہاں سکھ فوجیں سردار چتر سنگھ حاکم ہزارہ اور اس کے بہادر فرزند سردار شیر سنگھ کی ماتحتی میں اپنی قومی حکومت و آزادی کے واسطے آخری جد و جہد کرنے جمع ہوئی تھیں۔ ابتدائی آویزشوں کے بعد، جنگ کا اصلی معرکہ جہلم کے کنارے چلیان والہ کے میدانوں میں ہوا جو لاہور سے تقریباً سو میل شمال مغرب میں واقع ہے (جنوری ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۴ھ) سکھ سپاہیوں کی بہادری اور جنگ جوئی ہمیشہ سے مسلّم ہے لیکن اس موقع پر اُن کو بہت اچھے سپہ سالار ملے اور ایک اعتبار سے لڑائی میں انھی کو کامیابی ہوئی کہ انگریزی فوجوں کو میدان سے ہٹ کر قصبۂ چلیان والہ تک واپس آنا پڑا[1] مگر اس کے تھوڑے ہی دن بعد ملتان تسخیر ہوگیا اور وہ انگریزی فوجیں جو اس شہر کے محاصرے میں مصروف تھیں۔ گف کی امداد کے لئے پنجاب پہنچ گئیں؛ ادھر شیر سنگھ کو رسد رسانی کی مشکلات نے اپنے مضبوط مورچے چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ لاہور کی سمت میں بڑھ رہا تھا کہ چناب

[1] اس لڑائی میں فریقین کا بہت نقصان ہوا اور دونوں اپنی فتح کے دعویدار تھے۔ مگر مارشمینؔ یہ معترف ہے کہ جنگ کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں قریب قریب شکست ہی ہوا! چار انگریزی توپیں اور تین انگریزی پلٹنوں کے جھنڈے غنیم نے چھین لئے انگریزی (گوروں کے) رسالے کی شہرت پر (جسے قلیل التعداد سکھ رسالوں نے بہت بُری طرح بھگا دیا تھا) سخت حرف آیا اور اسی مناسبت سے سکھوں کی جوانمردی کا شہرہ زیادہ ہوگیا۔ انگریزی فوج کے مقتولین و مجروحین کا شمار ۲۴۴۶ تھا اور اسی میں نواسی افسر شامل تھے! اگرچہ گورنر جنرل (ڈلہوزی) نے سرکاری طور پہ اس لڑائی کو اپنی فتح بتایا اور انگریزی قلعوں سے اس کی خوشی میں سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں، لیکن شیر سنگھ اس سے پہلے اور میدان جنگ ہی میں شام کے وقت اپنی فتح کی سلامی سر کرچکا تھا۔ اور ہندوستان میں بھی عام طور پر اس لڑائی کو انگریزوں کی سخت اور افسوسناک ہزیمت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح انگلستان میں جب جنگ کی اطلاع پہنچی تو برطانوی توپوں اور جھنڈوں کا چھن جانا، برطانوی رسالے کا دشمن کے سامنے سے فرار ہونا اور ایک پوری برطانوی رجمنٹ کا ہلاک ہونا! ایسے واقعات تھے کہ انھیں سنکر وہاں لوگوں میں سراسیمگی اور ناراضی پیدا ہوگئی۔ ان تمام مصائب کی اصلی وجہ واجبی طور پر لارڈ گف کی بُری تدابیر جنگ کو قرار دیا گیا اور ڈیوک آف ولنگٹن کے اتفاق رائے سے گف کو عہدۂ سپہ سالاری سے

عبور کرنے سے پہلے قصبۂ گجرات کے قریب انگریزی فوجوں نے اسے آلیا اور چند ہی گھنٹے کی گولہ باری میں سکھوں کی ترتیب درہم برہم کر دی اور دن ڈھلتے ڈھلتے پنجاب کی آزادی کے یہ آخری حامی اپنی سب توپیں اور جنگی سازوسامان چھوڑ کر میدان سے فرار ہو گئے (فروری ۱۸۴۹ء ۱۲۶۵ھ) دریائے سندھ کے پار تک ایک انگریزی فوج نے شکست خوردہ سکھوں کا اور اُن کے بعض افغانی مددگاروں کا تعاقب نہ چھوڑا اور چند ہی ہفتے میں اہل پنجاب کی زبردست جنگی قوت بالکل فنا ہو گئی۔

الحاق پنجاب

اس کامیابی کے بعد ڈلہوزی نے نظمائے کمپنی یا اپنی کونسل کی رائے لئے بغیر، بلا پس و پیش ملک **پنجاب** کے الحاق کا اعلان کر دیا (۱۸۴۹ء) اور نابالغ دلیپ سنگھ کو سالانہ وظیفے پر علیحدہ کر کے راجہ کی ذاتی جاگیرات، عمارات حتیٰ کہ زیورات پر بھی خود قبضہ کر لیا۔ انھی زیورات میں "کوہ نور" نامی مشہور ہیرا بھی تھا جو اب تاج انگلستان کی زینت ہے۔ اہل پنجاب سے اسلحہ لے کر اندرونی امن و انتظام کے لئے **پولس** کا ایک بہت بڑا محکمہ قائم کیا گیا اور مالی اور عدالتی صیغوں میں مفید اصلاحیں عمل میں آئیں۔ بیرونی حملوں سے حفاظت کے لئے سرحد پر بہت سے نئے قلعے اور چھاؤنیاں بنا دی گئیں اور ایک خاص "گشتی فوج" (موبائل آرمی) مرتب کی گئی کہ وقت ضرورت بہ عجلت ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ جائے[1]۔

برما کی دوسری جنگ

ان ملکی انتظامات میں ڈلہوزی کے کئی سال صرف ہوئے اور ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں ہندوستان کے دوسرے سرے پر جو جنگ چھڑی وہ بھی ایک حد تک اتفاقی واقعات ہی کا نتیجہ تھی اور پہلے سے اس کا کوئی خاص ارادہ یا سامان نہیں کیا گیا تھا۔ اس جنگ کے جو اسباب انگریزی تاریخوں میں بیان کئے گئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی شکست کے باوجود برما کے راجہ کے غرور یا کم سے کم انگریزوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں بعض انگریز سوداگروں پر زیادتیاں ہوئیں اور اُنکی طرف سے ڈلہوزی نے راجہ سے باقاعدہ شکایت اور تاوان دلانے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے ان مراسلوں کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو انگریز سفیر نے اپنی حکومت سے اجازت لئے بغیر

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۵) ہٹا کر اس کی بجائے سر چارلس نے پیئر کو مقرر کیا گیا" (صفحہ ۴۶۵)

[1] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۰۰، ۷۰۱۔ زیورات کی ضبطی کے لئے دیکھو کین جلد دوم صفحہ ۲۰۱۔

اہل برما نے ایک جہاز کو پکڑ لیا۔ برما والوں نے مزاحمت کی اور آخر کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی طرف سے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا (اپریل ۱۸۵۲ء ۔ ۱۲۶۸ھ)

اس لڑائی میں اہل برما انگریزی فوجوں کا کوئی قابل ذکر مقابلہ نہ کر سکے اور انگریزوں کا بلا وقت پروم تک سواحل برما پر قبضہ ہو گیا۔ بایں ہمہ راجہ نے شرائط صلح ماننے سے قطعی انکار کیا اور نظمائے کمپنی کی رائے یہ ہوئی کہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا جائے مگر ڈلہوزی نے یک بہ یک ایک غیر قوم کے اتنے وسیع علاقے کا الحاق کرنا مناسب نہیں سمجھا اور صرف جزیرہ نمائے پیگو اور ساحلی اضلاع کمپنی کے زیر نگین کر لئے جس سے ایک طرف تو سنگاپور تک خلیج بنگالہ کا پورا ساحل براہ راست انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور دوسری طرف برما کا ملک ایک چھوٹی سی ریاست رہ گیا اور اس کی دفاعی قوت محدود و کمزور ہو گئی ؎

مختلف علاقوں کی ضبطی

ایک چھوٹی سی تعزیری مہم ۱۸۵۰ء میں سکھم کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی اور بعض انگریزوں کے ساتھ بدسلوکی کی سزا میں اس پہاڑی ریاست کا تھوڑا سا علاقہ چھین لیا گیا، اس کے سوا اور کوئی جنگی کارروائی ڈلہوزی کو نہیں کرنی پڑی۔ بایں ہمہ اس کے زمانے میں ہندوستان کے متعدد علاقے کمپنی کے قبضے میں آئے اور کئی دیسی ریاستوں پر انگریزوں کا براہ راست تصرف و تسلط قائم ہوا۔ اس قبضے کے لئے ڈلہوزی نے جو طریقہ اختیار کیا اُسے ہم اصطلاحاً "قانون استقراض"[۱] کہیں گے یعنی جب کسی ماتحت ریاست کا رئیس لاولد فوت ہو جاتا تھا تو کمپنی ریاست کا خاتمہ کر کے اس پر خود قابض ہو جاتی تھی ؎

ڈلہوزی کے مذکورہ بالا اصول پر انگلستان و ہندوستان میں بہت کچھ مباحثے ہو چکے ہیں۔ اکثر انگریز اہل الرائے اس قسم کی ضبطی کو بالکل جائز بلکہ عین مناسب بتاتے ہیں۔ اور بعض نے سخت الفاظ میں ڈلہوزی پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ طریقہ قزاقوں کے مناسب حال ہو تو ہو کسی سلطنت کے ارباب حکومت کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے[۲] لیکن قانون استقراض کے جواز و عدم جواز کی اخلاقی بحث کو چھوڑ کر، اگر ہم اس کے سیاسی نتائج و عواقب پر غور کریں تو

---

[۱] یعنی "ڈوکٹرن اوف لیپس" Doctrine of Lapse جس کا "قانون بازگشت" کے لفظ سے بھی ترجمہ کرتے ہیں لیکن ہمیں استقراض سے بہتر کوئی مرادف نہیں مل سکا۔

[۲] مثلاً دیکھو مارشمن صفحہ ۶، ۷، ۸ وغیرہ

بھی ماننا پڑے گا کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں اس قسم کے قوانین کا نفاذ دور اندیشی کے خلاف ہے۔ مگر اس طرزِ عمل کا صرف ڈلہوزی کو ذمہ دار قرار دینا، درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اول تو پہلے بھی دو ایک مرتبہ لاولد رئیسوں کی ریاستیں ضبط کی جا چکی تھیں دوسرے آوگ لینڈ ہی کے زمانے میں کمپنی کا یہ اصولِ حکومت معرضِ تحریر میں آگیا تھا کہ "ہمارے سیاسی طریق عمل کا صاف اور واحد مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ملکی مقبوضات اور آمدنی کے اضافے کا کوئی جائز اور مستحسن موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ البتہ جو حقوق پہلے سے واجب ہیں ان کا احتیاط کے ساتھ احترام کیا جائے"۔ اس کے علاوہ ڈلہوزی نے جتنی ریاستیں ضبط کیں ان سب کی اسے نظمائے کمپنی بلکہ خود حکومتِ انگلستان نے منظوری دی اور تائید کی[1]۔

الحاق ستارا، ناگپور، جھانسی وغیرہ

الغرض قانونِ استقراض کی رو سے ڈلہوزی نے جن ریاستوں کو ضبط کیا اُن میں سب سے بڑی اور مشہور ستارا، ناگپور، اور جھانسی کی ہندو ریاستیں تھیں جن کے رئیس لاولد فوت ہوئے اور اُن کے لے پالک بیٹوں یا دوسرے عزیزوں کی وراثت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جیت پور (بندھیل کھنڈ) سنبھل پور (اڑیسہ) اور بھگت وغیرہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ڈلہوزی نے ضبط کیں اور اسی ضمن میں آخری پیشوا باجی راؤ کا (جو لاولد فوت ہو گیا تھا) سالانہ وظیفہ بھی اس کے پس ماندوں کو دینا موقوف کر دیا۔ ریاستِ قرولی بھی قانونِ استقراض کی زد میں آگئی تھی مگر اس کی قدامت کی بنا پر نظمائے کمپنی نے اسے ضبط کرنا پسند نہیں کیا۔

اسی زمانے میں نواب عظم الدولہ یا عظیم الدولہ کا انتقال ہوا۔ (۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) یہ نواب محمد علیخاں والئی کرناٹک کا وہی پوتا تھا جس نے عمدۃ الامرا کی وفات کے بعد خطاب نوابی لے کر حکومت و ریاست سے دست برداری لکھ دی تھی۔ اب اُس کا یہ رسمی خطاب اور بعض اور مراعات بھی موقوف کر دی گئیں تاہم اس خاندان کا بزرگ ابھی تک احاطۂ مدراس کے دیسی رئیسوں میں سب سے اعلیٰ شمار ہوتا ہے۔

برار و اودھ

برار و اودھ کے الحاق کا معاملہ جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ "عہد معاونت" کی رو سے جو امدادی فوج نواب نظام الملک کو انگریزوں کے ماتحت رکھنی پڑتی تھی

---

[1] مارشمین صفحہ ۷۶، اوڈس اس ۴۳

اس کے ادائی مصارف میں اکثر تاخیر اور دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ریاست حیدرآباد کے عام انتظامات کے متعلق بھی کمپنی کے عہدہ داروں کو بہت سی شکایتیں تھیں لیکن ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں اسیقدر بداخلت پر اکتفا کی کہ ملک برار کو ٹھیکے کے طریق پر نواب نظام الملک سے لے لیا۔ یہی ٹھیکہ ہے جو بہت عرصے بعد لارڈ کرزن کے زمانے میں "دوامی" قرار دیا گیا اور اب اگرچہ برار اعلحضرت نواب نظام الملک ہی کی ملک ہے لیکن اس نئے پٹے کی رو سے سرکار عالی کو اُس کے مداخل و مصارف سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

اودھ کی بدانتظامی کی وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ بار بار شکایت کرتے رہتے تھے۔ لیکن ۱۸۰۱ء کے معاہدے کے بعد فوجی مصارف کے عذر پر اس ریاست کا مزید علاقہ لینے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور اگرچہ یہاں کے نام نہاد بادشاہوں کی نااہلی اور بدعنوانیاں واقعی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں لیکن رعایا پر اُن کے ظلم و جبر کرنے کا الزام کچھ وقیع و درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس بات کی بھی بعض شہادتیں ملتی ہیں کہ مجموعی طور پر باشندگان اودھ کی خوش حالی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ قریب کے انگریزی اضلاع سے بہت لوگ نقل مکان کرکے ریاست اودھ میں آبسے تھے[۱]۔ کم سے کم عام باشندوں میں اس بات کی مطلق خواہش نہ تھی کہ شاہانِ اودھ کی بجائے وہاں کمپنی کی حکومت قائم ہو۔ اور جیسا کہ ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے اگر واقعی ڈلہوزی کا خیال یہ تھا کہ اودھ کا الحاق وہاں کے لوگوں کے لئے موجب مسرت و شکر گزاری ہوگا، تو آئندہ واقعات نے اُس کی بہت بُری طرح تکذیب کی یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عام اہل ملک نے سب سے زیادہ اودھ ہی میں انگریزوں سے عداوت و مخالفت کا اظہار کیا[۲]۔

لیکن اودھ کی بادشاہی کو مٹانے کا الزام ڈلہوزی کو دینا درست نہ ہوگا۔ نظمائے کمپنی اور حکومت انگلستان کو جو آخری مراسلات اودھ کے متعلق ڈلہوزی نے بھیجے اُن میں وہاں کی بدنظمی کی شکایات لکھنے کے ساتھ اس بات کو بھی جتایا ہے کہ شاہان اودھ کمپنی کے ساتھ ہمیشہ خیر خواہی اور وفاداری کا سلوک کرتے رہے ہیں اور انھیں بادشاہی سے محروم کرنا

---

[۱] ملاحظہ ہو کین جلد دوم صفحہ ۱۱۶
[۲] کین جلد دوم صفحہ ۲۰۹

کمپنی کی سخت ناشکری اور بے انصافی ہوگی، البتہ ڈلہوزی کی یہ رائے ضرور تھی کہ اودھ کے انتظامات براہِ راست انگریز عہدہ داروں کے حوالے کردیئے جائیں اور نظم و نسق میں بادشاہ کا کوئی دخل نہ رہے۔ ہندوستان کے انگریز حکام کا ایک اور گروہ اس کارروائی کو بھی ناجائز اور معاہدات کی صریح خلاف ورزی جانتا تھا اور اس گروہ کے نزدیک اودھ کے اندرونی معاملات میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنی مداخلت کی جاسکتی تھی کہ وہاں کے انتظامات ریزیڈنٹ یا کسی انگریز عہدہ دار کی نگرانی میں لے لئے جائیں لیکن سرکاری ملازمین جہاں تک ممکن ہو، سب ویسے رہیں اور مداخلِ شاہی میں سے کمپنی خود ایک حبّہ بھی وصول نہ کرے!

مگر وزرائے انگلستان اور نظمائے کمپنی نے اس تجویز کو نہ مانا اور ادھر بادشاہی کا خالی خطاب لے کر سلطنت انگریزوں کے حوالے کردینے پر واجد علیشاہ رضامند نہ ہوا لہٰذا ڈلہوزی نے حکماً اُسے لکھنؤ سے ہٹا کر کلکتہ بھیجدیا اور اودھ کی "بادشاہی" کے خاتمے اور مقبوضاتِ کمپنی میں داخل کر لئے جانے کا اعلان کرادیا[1] (فروری ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ)

نئے انتظامات

اودھ کا الحاق ڈلہوزی کا آخری سیاسی کارنامہ ہے اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد وہ انگلستان واپس چلا گیا لیکن اندرونی نظم و نسق میں بھی اس کی بعض اصلاحات قابلِ یادگار ہیں۔ وہ نہایت ذہین و جفاکش آدمی تھا اور قریب قریب ہر شعبۂ حکومت کی بذاتِ خود نگرانی رکھتا تھا۔ بعض علمی اصلاحات کے علاوہ بنگالے میں علیحدہ ایک "نائب گورنر" کا تقرر اسی کی تجویز سے ہوا (۱۸۵۴ء) ورنہ اس وقت تک گورنر جنرل ہی بنگالے کے مقامی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

اسیطرح "امورِ عامہ" کا کام فوجی عہدہ داروں سے لے کر اسے ایک مستقل ملکی محکمہ بھی ڈلہوزی ہی نے بنایا اور بڑے پیمانے پر عمارات اور سڑکوں کی تیاری کا کام شروع کیا۔ ریلوں کو ہندوستان میں سب سے پہلے جاری کرنے کا فخر بھی اسی گورنر جنرل کو حاصل ہے اور اگرچہ اس کے زمانہ حکومت میں بمبئی سے تھانہ اور کلکتہ سے رانی گنج (کوئلہ کی کان) تک فقط چند میل کی پٹری تیار ہوئی تھی لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات تک

[1] مذکورۂ بالا واقعات کے لئے دیکھو مارش مین صفحہ ۴۰۲۔ اڈس ہس ۶۰۰، کین جلد دوم ۹۹-۲۰۸

ریل بے جانے کے نقشے ڈلہوزی کی نگرانی میں مرتب ہو گئے تھے جن کی تکمیل کچھ عرصے کے بعد ہوئی۔ انھی دنوں برقی تار کی ایجاد سے اہل ہند آشنا ہوئے اور ڈاکخانے کے سرکاری محکمے کی نہایت مفید توسیع و اصلاح عمل میں آئی چنانچہ آدھ آنے کے ٹکٹ میں ہندوستان کے ہر مقام پر خط پہنچ جانے کا انتظام ڈلہوزی ہی کی حُسنِ تدبیر کی یادگار ہے۔

۲۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ

شورش کے اسباب:- (۱) ہندوستانی فوج میں

فروری ۱۸۵۶ء میں جب ڈلہوزی نے اپنے جانشین لارڈ کینِنگ کو حکومت ہند کا جائزہ دیا تو آئندہ شورش و فساد کا سب مواد قریب تیار تھا لیکن یہ بات کہ آنے والے طوفان کی ہندوستان کے انگریز حکام کو کچھ خبر نہ تھی خود ڈلہوزی کی رخصتی تقریروں سے ظاہر ہے اس کے علاوہ انھی دنوں حکومت انگلستان کی چین و ایران کے معاملات میں مداخلت نے جنگ و جدال کی نوبت پہنچائی تو بعض گورا فوج کے دستے ہندوستان سے باہر بھیج دیئے گئے اور اگر ونسنٹ اسمتھ کی تحقیقات صحیح ہے تو ۱۸۵۶ء کے اخیر میں ہندوستان کی گورہ فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔[1] اور یہ واقعہ بھی انگریزی حکام کے مادۂ شورش سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت کر دینی ضرور ہے کہ اس زمانے کی انگریزی افواج میں ہندوستانی سپاہیوں کا تناسب اسّی فی صدی سے بھی زیادہ تھا اور کل دو لاکھ اڑتیس ہزار سپاہیوں میں صرف اڑتیس ہزار گورے یا انگریز سپاہی تھے۔ دوسرے اُن دنوں ہندوستانی سپاہی اور سرداروں کی ذاتی وجاہت اور اعتبار و وقعت زیادہ تھی اور توپ خانہ، میگزین وغیرہ کی حفاظت کے اہم کام بھی ہندیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔

اس ہندوستانی فوج کی بددلی اور ناراضی کا ایک سبب تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اہل ملک کی انگریزوں سے عام ناخوشی اور بدگمانی کا سپاہیوں پر بھی اثر پڑتا تھا۔ دوسرے یہ سپاہی جس قدر زیادہ دور دور کی لڑائیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اسی قدر تنخواہ یا بھتّے میں اضافے کا مطالبہ کرتے تھے۔ ہندو سپاہیوں کو دور دراز ممالک۔ اور خاص کر سمندر یا دریائے سندھ کے پار جانے میں بعض مذہبی عذرات تھے لہٰذا جب اُن کے مذکورۂ بالا

[1] اوکسفرڈ ہسٹری ص ۷۱۱۔ نیز دیکھو انز صفحہ ۲۰۲

مطالبات بھی سرکار نہ مانتی تھی تو وہ بہت ناراض ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مہم کابل کے بعد سے دوسری جنگ برما کے زمانے تک۔ صرف آٹھ دس برس کے اندر چار مرتبہ اسی اضافے اور بھتے کے معاملے میں جھگڑا ہوا اور فوج کی بعض پلٹنیں علانیہ شورش و فساد پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ اسی بنا پر کے ننگ نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں یہ قاعدہ بنایا کہ دکنی سپاہیوں کی طرح "آئندہ" "افواج بنگالہ" میں بھرتی ہونے والے سپاہیوں سے یہ اقرار لیا جائے کہ وہ ہر جگہ جہاں سرکار بھیجے گی بلا عذر جائیں گے۔ اگرچہ ان سپاہیوں پر جو پہلے کے ملازم تھے اس اقرار کی شرط واجب نہیں کی گئی تھی تاہم اس جدید قاعدے نے انہیں بہت ناخوش کیا کیونکہ نئے بھرتی ہونے والوں میں زیادہ تر انھی سپاہیوں کی اولاد اور خاندان کے لوگ ہوتے تھے! اس جگہ یہ وضاحت اور کر دینی چاہئے کہ بنگالے کی فوجوں میں سکھوں اور گورکھوں کی چند نئی پلٹنوں کے سوا "تقریباً" تمام سپاہی "ہندوستان خاص" کے باشندے تھے۔ ان میں بھی مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ہندوؤں میں بہت سے اونچی ذات کے کھتری اور برہمن سپاہی تھے جنھیں مذہبی قیود کا سب سے زیادہ لحاظ و احساس ہوتا ہے[51]!

(۲) عام رعایا میں

عام رعایا میں انگریزوں کے خلاف شورش و ناراضی کے اسباب بالکل دوسرے اور کہنا چاہئے کہ ایک حد تک قدرتی تھے۔ ڈلہوزی کے زمانے میں جس تیزی سے کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اس نے اہل ہند کو سخت حیران و سراسیمہ کر دیا تھا۔ یوں بھی گزشتہ بیس تیس برس میں انگریز عہدہ داروں کے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آتا تھا اب کمپنی سوداگروں کی جماعت نہ تھی اور نہ اُسے "بادشاہِ دہلی" کی رسمی اطاعت و نیابت کی پروا رہی تھی کیونکہ مدت سے "ممالک سند" کا یہ نام نہاد فرمانروا محض کمپنی کا ایک مجبور و بے بس وظیفہ خوار رہ گیا تھا۔ اور ادھر انگریزوں کی قوت و سطوت میں وہ ترقی ہوئی تھی کہ انھوں نے ناگپور و ستارا کی بڑی بڑی ریاستوں کا قلم کی ایک جنبش سے خاتمہ کر دیا۔ شاہِ اودھ کو بھرے دربار میں اس کی معزولی کا حکم سنایا اور ایک قیدی کی طرح بے روک ٹوک لکھنؤ سے لے گئے۔ چند ہفتے کے اندر اندر سکھوں کی جنگی قوت خاک میں ملا دی۔ سندھیا کی فوج سے ہتیار رکھوا لئے۔ غرض ہندوستان میں جس طرف انھوں نے

---

[51] اوکس ہس، ۳۷، ۱۲۷- اِنز صفحہ ۳۰۵ وغیرہ

رُخ کیا اور جو ملک لینا چاہا۔ کامیابی پائی۔ اور جو اُن کے مقابلے میں آیا وہی ناکام و سرنگوں ہوا۔

ان واقعات نے اگر انگریزوں کو بجائے خود مغرور اور ان کی نظر میں ہندیوں کو ذلیل و خوار کر دیا ہو۔ تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ لارڈ کیننگ نے حکومت کا کام سنبھالتے ہی دہلی کے نام نہاد بادشاہ کو بھی سرکاری طور پر یہ اطلاع دے دی تھی، کہ یہ بادشاہی کا خطاب اور قلعۂ معلّٰی کی سکونت اور "دربار" لگانے کی اجازت فقط آپ کے (یعنی بہادر شاہ بادشاہ کے) دم تک ہے اور آپ کے بعد اگرچہ "شہزادۂ ولی عہد" کو آپ کا جانشین اور "خاندانِ تیموریہ" کا بڑا مان لیا جائے گا اور مقررہ وظیفہ بھی جاری رہے گا۔ لیکن وہ جانشین خطاب بادشاہی سے محروم ہوں گے اور "قلعۂ شاہجہانی" میں آیندہ گوروں کی فوج رہے گی۔[۱]

طبقۂ امرا

شاہِ اودھ کی معزولی کے بعد ہی اس دوسری اطلاع نے ہندوستان کے لوگوں میں سناٹا سا ڈال دیا۔ طبقہ اعلیٰ کے قدامت پسند و رسم پرست "امرا"، (یعنی موروثی جاگیردار) تو معلوم ہوتا ہے یہ خبریں سُنکر انگریزوں سے اور بھی مرعوب ہو گئے۔ کسی مُلکی یا مِلّی حمیت کا ان میں جذبہ نہ تھا۔ اُن کے حوصلے پست۔ دل مردہ ہو چکے تھے۔ اخلاقی اور تمدنی خرابیوں نے انھیں اس قدر ضعیف و ناکارہ کر دیا تھا کہ ذاتی اغراض و مفاد کے لئے بھی جد و جہد یا ایثار و قربانی گوارا کرنے کی انہیں صلاحیت نہ تھی۔ انگریزوں کے تسلط نے سب سے زیادہ نقصان انھیں امرا کو پہنچایا تھا۔ یہی راؤ، راجہ اور خان و میرزا دولت و حکومت سے محروم ہوئے تھے۔ لیکن اُن کو اِس نقصان کا احساس اور انقلاب سلطنت کا ارمان تھا بھی تو وہ عملاً خود کچھ کرنا نہ چاہتے تھے اور نہ اتنا بڑا کام کرنے کی درحقیقت قابلیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آیندہ فتنہ و فساد میں اگر اس طبقے کے بعض افراد نے کوئی حصہ لیا بھی تو بیہودہ جوشِ انتقام اور بے محل بہادری دکھانے کے سوا، ان کے کسی کام سے وہ دور اندیشی یا وہ ارادے کی پختگی اور لوگوں پر حکومت کرنے کی لیاقت ظاہر نہیں ہوتی جو ایک مُلکی رہنما یا قومی سردار کا سب سے ضروری وصف ہوا کرتا ہے۔

---

[۱] مارش مین صفحہ ۴۹۱ و ۴۹۰

طبقۂ متوسط وعوام

ان "سیاسی اوصاف" کے اعتبار سے ہندوستان کے متوسط اور عام طبقے کے لوگ امرا سے بھی بدتر تھے۔ شخصی بادشاہی نے صدیوں سے عوام الناس کو ملکی معاملات سے بالکل بے دخل و بے خبر کر دیا تھا اور مساوات و آزادی کے ساتھ مل کر اپنے ملکی معاملات انجام دینے کی ان میں مطلق اہلیت نہ تھی بے شبہ ان میں رنجیت سنگھ یا حیدر علی جیسے لوگوں کا پیدا ہونا ممکن تھا لیکن ایسے شخصی اقتدار حاصل کرنے کا زمانہ گزر چکا تھا کیونکہ اب جو قوت اہل ہند کے مقابلے میں آئی اس کی پشت پر ایک پوری قوم کا ہاتھ تھا۔ خود ہندوستان کے عوام الناس ایک حد تک سمجھتے تھے کہ اُن کا انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہے۔ بایں ہمہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اس بے بسی کے احساس نے اُن کو دل میں اپنے امرا سے زیادہ انگریزوں کا دشمن بنا دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ گو ملک و حکومت میں عوام کا کوئی حصّہ نہ تھا لیکن کمپنی کے تسلط نے صرف ہندوستانی رئیس، وراجہ ہی کو دولت و حکمرانی سے محروم نہیں کیا بلکہ جہاں اس کی حکومت پہنچی وہاں کسانوں پر مالگزاری کی سختیاں بڑھ گئیں۔ دیسی مصنوعات کا بازار سرد ہو گیا اور ہزاروں ہندوستانی پیشہ ور بے روزگار و مفلوک الحال رہ گئے۔ غرض غیر قوم سے طبعی نفرت۔ اس کی قوت کا خوف۔ اقتصادی پریشانیاں اور عام جہالت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل ہند اپنے نئے حکمرانوں سے سخت بیزار ہو گئے۔ پھر قحط و گرانی، وبا اور بیماری غرض ہر قسم کی مصیبت کا الزام کمپنی کے سر لگایا جانے لگا۔ انگریزوں کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی سچی افواہیں ملک میں گشت کرنے لگیں۔ اور ان میں سب سے بڑھکر اس افواہ نے لوگوں کو اشتعال دلایا کہ انگریز ہندوستانیوں کا دین بگاڑنا اور اُن کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں ؛

مذہبی تعصبات

اسے انگریز عہدہ داروں کی لائق تعریف خوش اعتقادی سمجھئے یا قابل اعتراض نادانی، مگر یہ امر مسلم ہے کہ انھی کی مدد اور حمایت کے زور پر عیسائی پادری زیر نظر عہد میں ہندوستان کے ہر ضلع اور شہر میں مختلف طریقوں سے دین مسیحی کی تبلیغ کرنے لگے بعض بڑے عہدہ دار ان کی علانیہ سرپرستی کرتے تھے اور جنھیں خود اپنے مذہب کی اشاعت سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اُن کی "آزاد خیالی" بھی اہل ہند کے اُن مذہبی عقائد کی روادار نہ تھی جنھیں یہ انگریز اوہام باطل جانتے تھے[1] ایسے ملک میں جہاں کے عوام الناس ہر نئی چیز کو خوف و بدگمانی

[1] دیکھو اوکس ہس صفحہ ۱۴، ۷ اور انز صفحہ ۳۰۳

کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جہاں فقط کوٹ پتلون پہن لینے پر کفر کا فتویٰ لگ جاتا تھا، انگریز عہدہ داروں کی یہ مذہبی سرگرمی یقیناً حیرت انگیز ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ویلور، ٹراونکور، بریلی، دمدم وغیرہ مقامات پر جو ہنگامے برپا ہوئے اُن کا بھی انگریزوں کو تجربہ تھا کہ کس طرح ایک چھوٹی سی بات اہل ہند کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر دیتی ہے۔ بایں ہمہ ماننا پڑتا ہے کہ اپنی قوت و حکومت کے زور اور نیز نئی ضروریات نے انگریز حکام کو بارہا ہندوستانیوں کی ناراضی کی طرف سے بے پروا کر دیا اور اسی بے پروائیوں کا نتیجہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں فوجی سپاہیوں کی بغاوت اور پھر عام ہنگامے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

آغاز فساد۔ (۱) میرٹھ میں

شمالی ہند کے سپاہیوں کی بدولی کا ایک تازہ ترین سبب تو لارڈ کیننگ کا وہ فوجی قاعدہ تھا جس کا حال ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ آئندہ ہر بھرتی ہونے والے پر یہ عہد کرنا واجب قرار دیا گیا کہ سرکار انگریزی جہاں بھیجنا چاہے گی وہاں اُسے بلا عذر جانا پڑے گا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد (جنوری ۱۸۵۷ء) ایک نئی قسم کی بندوق (اِن فیلڈ رائفل) فوجوں میں رائج کی گئی جس کے کارتوس کو پہلے چربی سے چکنا کرنا پڑتا تھا اور پھر دانت سے اس کا ایک سرا کترا جاتا تھا۔ اس چکنے کارتوس اور اُس کے بھرنے کے نئے طریقے نے ہندوستانی فوجوں میں عجیب قسم کی بدگمانی اور ناراضی پیدا کر دی اور عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے عقائد خراب ہوں، انگریزی حکومت کی طرف سے ان اوہام کو دور کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اپریل کے مہینے میں سب سے اول میرٹھ کی فوج کے (نوّے) سپاہیوں نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا۔ اور اس حکم عدولی کے جرم میں انھیں فوجی عدالت نے دس سال قید بامشقت کی سزا کا فیصلہ سنایا۔ پھر تمام فوج کو جمع کر کے ان مجرمین کی سرِ عام وردی اتار کی گئی اور ہتھکڑیاں ڈال کر جیل خانے بھیج دیا گیا[۱] (مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ)

اس واقعے نے گویا باروت کو چنگاری دکھا دی۔ ناراض سپاہی اپنے ساتھیوں کی یہ تذلیل و رسوائی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے اور دوسرے دن جب اُن کے انگریز افسر گرجا میں اتوار کی نماز پڑھنے جا رہے تھے، غضب ناک سپاہیوں نے ان پر حملہ کر کے قریب قریب

---

[۱] مارشمن میں صفحہ ۴۹۲ وغیرہ

سب کو قتل کر ڈالا اور اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑا لائے۔ ساتھ ہی شہر میں عام ہنگامہ برپا ہو گیا اور میرٹھ کے بازاریوں نے انگریزوں کے قتل و غارتگری میں بڑے شوق سے سپاہیوں کا ہاتھ بٹایا۔ قید خانے کھول دیئے گئے۔ انگریزوں کے بنگلے اور عمارتیں جلا دی گئیں جو انگریز عورت، مرد، بوڑھا، بچہ، بلوائیوں کے ہاتھ پڑا، کمال بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

میرٹھ میں گورہ فوج بھی موجود تھی مگر سپہ سالار کی بزدلی یا نااہلی سے وہ مذکورۂ بالا شورش و فساد کا کوئی انسداد نہ کر سکی اور بپھرے ہوئے سپاہیوں نے دہلی کی راہ لی جہاں ان کے پہنچتے پہنچتے بلوہ ہو گیا تھا اور انگریزوں کو چن چن کے مارا جا رہا تھا۔ دہلی میں گولا بارود کا بہت سا ذخیرہ موجود تھا اور مشہور ہے کہ جب اسے بچانا محال نظر آیا تو وہاں کے انگریز سپاہیوں نے اس ذخیرے میں آگ لگا دی جس سے صدہا ہندوستانی جو میگزین پر یورش کر رہے تھے اڑ گئے اور آگ دینے والے انگریز بھی گویا اپنے ہاتھ سے خود ہلاک ہو گئے[1]۔

(ب) دیگر مقامات میں

میرٹھ کی طرح تھوڑے تھوڑے دن بعد "ہندوستان خاص" کی قریب قریب ہر چھاونی میں اسی قسم کے فساد برپا ہو گئے، پنجاب کے انگریز عہدہ داروں نے بڑی مستعدی اور دور اندیشی سے ہندوستانی فوجوں کے ہتھیار لے لئے اور اس میں انھیں سکھوں کی تازہ بھرتی کی ہوئی سپاہ سے بہت مدد ملی۔ یہ سکھ "ہندوستانیوں" کی اس شورش میں شریک نہیں تھے بلکہ گزشتہ پنجاب کی لڑائیوں کی وجہ سے ان میں اور ہندوستانی یعنی دوآب کے سپاہیوں میں ایک قسم کی رقابت پیدا ہو گئی تھی[2]۔ غرض سکھوں نے اور سرحدہائے پنجاب کے بعض پہاڑی قبائل نے اس شورش و فساد میں آخر تک انگریزوں کا ساتھ دیا۔

---

[1] اس روایت کو بعض انگریزی کتابوں میں بہت مبالغہ آمیز طریق سے بیان کیا گیا ہے لیکن اول تو مارشمن کا بیان ہے کہ آگ دینے والے محافظین میں سے چار انگریز سلامت رہے (صفحہ ۴۹۶) دوسرے پورے میگزین میں بھی آگ نہیں لگی بلکہ بہت سا گولہ بارود بچ گیا جو بظاہر حملہ آوروں کے ہاتھ پڑا (اکس صفحہ ۱۶۷) اور ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھنے سے خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میگزین میں فی الحقیقت انگریز محافظوں نے آگ لگائی یا محض اتفاقیہ آگ لگ گئی تھی۔

[2] انز صفحہ ۳۰۲

بنگالے اور نربدا کے جنوب یعنی دکن کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر ہنگامہ نہیں ہوا لیکن مالوہ اور بندھیل کھنڈ اس آگ کے اثر سے محفوظ نہ رہے بلکہ ان علاقوں میں بہت دن تک اس کے شرارے بھڑکتے رہے اور یہاں امن و امان کے قائم ہونے میں سب سے زیادہ عرصہ لگا۔ اس طوالت کا بڑا سبب یہ ہوا کہ اُن تھوڑی سی گورہ یا دیسی فوجوں کو جو وفادار تھیں سب سے اوّل شمالی ہند کے مفسدوں سے جنگ کرنی پڑی جن کے دہلی، لکھنؤ، اور کانپور میں تین بڑے بڑے جنگی مرکز بن گئے تھے! دہلی میں باغی سپاہیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا اور شہر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی لیکن ضعیف العمر بادشاہ میں نہ انگریزوں سے لڑنے کی قوت و قابلیت تھی نہ آرزو۔ اور بادشاہ کی اولاد، دیگر خاندانی امرا یا ان باغی سپاہیوں میں کوئی ممتاز قابلیت کا سردار و سرگروہ نہ تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے انگریزوں کی ایک کم تعداد فوج نے اسی شہر کو گھیر کر فتح کر لیا (ستمبر ۱۸۵۷ء) جس نے اہل شورش کی عام طور پر ہمتیں پست کر دیں۔

مگر اس ہمہ گیر فساد کے سب سے بڑے معرکے اودھ میں ہوئے جہاں اہل شورش نے کچھ عرصہ محاصرے کے بعد کانپور اور لکھنؤ دونوں شہروں پر قبضہ کر لیا اور گو لکھنؤ کی گورہ فوج اور انگریز عہدہ دار بچ کر نکل گئے لیکن کانپور کے انگریزوں کو محاصرے کی سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہتیار ڈال دینے پڑے اور اس جمعیت کے ساتھ بہت سی انگریز عورتیں اور بچے بھی دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئے۔ اس مقام پر اہل شورش کا سرگروہ دھونڈو پنت ہو گیا تھا جو نانا صاحب کے عرف سے مشہور ہے یہ شخص آخری پیشوا باجی راؤ کا جسے انگریزوں نے کانپور کے قریب بٹھور میں بسا دیا تھا متبنیٰ اور جانشین تھا مگر جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ باجی راؤ کے بعد اس کا بیش قرار وظیفہ بند کر دیا گیا اور نانا صاحب کو صرف باجی راؤ کا ذاتی ساز و سامان اور تھوڑی سی جاگیر ورثے میں ملی، اس وظیفے سے محرومی نے اُسے انگریزوں سے ناراض کر دیا اور حق یہ ہے کہ جیسا خوفناک انتقام اُس نے لیا شاید کبھی انگریزی قوم سے کسی شخص نے نہ لیا ہوگا یعنی مشہور ہے کہ اوّل تو جب وہ انگریز جن سے قبول اطاعت کے وقت صحیح سلامت الہ آباد بھیجنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ دریا کے راستے جانے کے ارادے سے کشتیوں میں سوار ہوئے تو نانا صاحب کے حکم سے اُن پر گولیاں برسائی گئیں اور اس آتش فشانی سے بہت کم

انگریز بچ سکے۔ دوسرے سو سے زیادہ عورتیں اور بچے ناناصاحب کی حراست میں تھے۔ جس وقت کانپور پر انگریزی فوج نے چڑھائی کی اور ناناصاحب کو اپنی مخلصی کی امید نہ رہی تو انگریز راویوں کا بیان ہے کہ ناناصاحب نے سب انگریز عورتوں اور بچوں کو کمال بے رحمی سے قتل کرا دیا اور انکی لاشیں ایک کوئیں میں پھنکوا دیں جسے انگریزوں نے اس واقعے کی یادگار میں اب تک محفوظ رکھا ہے ؛

اس خوفناک قتل کے دو ہی دن بعد انگریزی فوج کانپور پر قابض ہو گئی تھی (جولائی ۱۸۵۷ء) لیکن نومبر میں اسے گوالیار کی تازہ دم باغی سپاہ سے شکست کھا کر شہر چھوڑنا پڑا اور اس پر آخری مرتبہ انگریزوں کا سال کے آخر میں قبضہ ہوا۔ پھر تین چار مہینے کی جنگ و کشمکش میں لکھنؤ کی تسخیر (مارچ ۱۸۵۸ء ۔ ۱۲۷۴ھ) کے ساتھ وہ اپنے دشمنوں پر پوری طرح غالب آ گئے۔ ناناصاحب اور اس کے بعض رفیق بچ کر نیپال کے علاقوں میں نکل گئے لیکن اودھ میں اہل شورش کی کوئی بڑی فوج باقی نہ رہی اور جب بریلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو روہیلکھنڈ بھی دشمنوں سے صاف ہو گیا اور سال کے ختم تک اس تمام حصّۂ ملک کے مقامی فتنہ و فساد فرو ہو گئے ؛

مالوہ اور بندھیل کھنڈ

سب سے آخر میں انگریزوں کو مالوے اور بندھیل کھنڈ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی اور یہاں ان کے مشہور سپہ سالار سر ہیوروز نے اوّل اندور، دھار، ساگر وغیرہ مقامات پر باغی سپاہیوں کو شکستیں دیں اور آخر میں جھانسی پر چڑھا جہاں کی بیوہ رانی لکشمی بائی نے بڑے پیمانے پر انگریزوں سے جنگ کا سامان کیا تھا۔ واضح رہے کہ جھانسی کی ریاست کو چند ہی سال پہلے قانون استقراض کی رو سے ڈلہوزی نے ضبط کیا تھا۔ اور انگریزوں کی اس زیادتی کا انتقام لینے کا جوش تھا جس نے لکشمی بائی کو محل سے نکال کر جنگ کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ ساٹھ ستر انگریز مرد اور اُن کے بیوی بچوں نے جھانسی کے قلعے میں پناہ لی تھی مگر جان بخشی کے اقرار پر اُنھوں نے اپنے آپ کو باغی سپاہیوں کے حوالے کر دیا تو اسی وقت اسی خونخوار رانی کے حکم سے وہ سب قتل کر دیئے گئے ؛ (جون ۱۸۵۷ء)

اس رانی کے پاس تقریباً بیس ہزار سپاہی جمع ہو گئے تھے۔ ناناصاحب اس کا مؤید و مددگار تھا اور سب سے بڑی کمک ان فوجوں سے پہنچ رہی تھی جنھوں نے کالپی کو اپنا جنگی مرکز بنا لیا تھا۔ ان فوجوں میں سب سے بڑی تعداد گوالیار کے

باغی سپاہیوں کی تھی جہاں اسی زمانے میں ریاست کی فوجیں موقوف کر کے ایک چیدہ "فوج امدادی" (یعنی کن ٹن جنٹ) انگریز افسروں کی ماتحتی میں تیار کی گئی تھی اور اب اس کے سپاہی اپنے نئے حاکموں سے منحرف ہو گئے تھے۔ شاہ اودھ کی سرکار کے بہت سے برطرف شدہ سپاہی بھی اُن سے آملے تھے۔ آخر میں خود نانا صاحب کا مشہور جنگی سردار تانتیا توپی اسی جتھے میں چلا آیا تھا اور کالپی کے مرکزی مقام سے شمالی مالوہ، اودھ، اور بندھیل کھنڈ میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف فساد بپا کر رہا تھا۔

اپریل ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) میں سر ہیو روز نے جھانسی پر حملہ کیا۔ تانتیا توپی رانی کی مدد کے لئے آیا تھا مگر شکست کھا کے پسپا ہوا۔ رانی کو بھی شہر چھوڑ کر کالپی کی طرف ہٹنا پڑا اور انگریز سپہ سالار نے جھانسی کی تسخیر کے بعد کالپی پر پیشقدمی کی جہاں غنیم نے بڑے اہتمام سے مورچے تیار کئے اور گولہ بارود کی فراہمی کے ساتھ توپ سازی کے کارخانے بھی بنا لئے تھے[1]۔ اس شہر کے قریب پہنچتے پہنچتے انگریزی فوج سے کئی لڑائیاں ہوئیں مگر ہر جگہ اہل شورش کو شکست ہوئی۔ پھر کالپی سے منتشر ہو کر وہ گوالیار کے قریب جمع ہوئے اور یک بہ یک اس شہر پر قبضہ کر لیا جس میں بہت سی توپیں اور جنگی ساز و سامان موجود تھا، روز اپنے نزدیک کالپی کی لڑائی میں جنگ کا خاتمہ کر چکا تھا۔ مگر اس خلاف توقع واقعے کی اطلاع ملتے ہی دوبارہ بڑھا اور گوالیار میں پھر باغیوں کو شکست دی۔ جھانسی کی رانی بھی اس معرکے میں لڑتی ہوئی ماری گئی (جون ۱۸۵۸ء) تانتیا توپی بھاگ کر نکل گیا تھا مگر سالِ آئندہ پکڑا ہوا آیا اور پھانسی پائی۔

عام رعایا کا حصّہ

اس فساد کی جسے عام طور پر "غدر ۱۸۵۷ء" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ آخری بڑی لڑائی تھی اور اس کے بعد باغی سپاہی یا اہل شورش کسی جگہ بڑی تعداد میں جمع نہ ہو سکے اور آہستہ آہستہ سالِ آئندہ کے اوائل میں یہ شورش فرو ہو گئی۔ گجرات راجپوتانہ، بنگال، اڑیسہ اور جنوبی ہند کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر ہنگامہ نہیں ہوا۔ ریاست حیدرآباد اور نیپال سے خود انگریزوں کی مدد کے لئے فوجی دستے بھیجے گئے اور سکھوں نے عام طور پر سرکار انگریزی کا ساتھ دیا حالانکہ چند ہی سال پہلے

[1] مارشمین صفحہ ۵۱۴

کمپنی نے اُن کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ جو کچھ شورش و جنگ ہوئی وہ ہندوستان خاص یا وسطی ہند کے شمال مشرقی اضلاع میں ہوئی اور یہاں کی نہ صرف فوجوں نے بغاوت کی بلکہ جا بجا عام باشندوں نے بھی انگریزوں کی عداوت اور قتل عام میں حصّہ لیا اور چند مہینے تک کمپنی کا سارا تسلط اور انتظام درہم برہم کر ڈالا۔ ہر مقام کے فسادات اور ان کے فرو ہونے کے حالات لکھنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ مگر اجمالی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو اہلِ شورش جن میں سپاہی اور عام لوگ دونوں گروہ شامل تھے مختلف وجوہ سے انگریزوں کے دشمن ہو گئے تھے لیکن اُن کے سامنے کوئی صاف اور واضح مقصد نہ تھا اور نہ ملک میں کوئی ایسا سردار ان کی رہ نمائی کو اٹھا جو اُن کو کسی معیّن راستے پر ڈال دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہنگامہ محض نفرت و انتقام کا ایک طوفان بن گیا جس کی ایک منتظم حکومت کے مقابلے میں دیرپا کامیابی نہ بظاہر ممکن تھی نہ مفید۔

نتائج

مذکورہ بالا شورش دو سال میں فرو ہو گئی۔ شورش کے خاص مرکزوں میں بھی بہت سے ہندوستانی (سپاہی اور غیر سپاہی) برابر انگریزوں کے وفادار رہے اور انھوں نے جا بجا انگریز مردوں اور عورتوں کو اپنے گھر میں چھپایا اور اُن کی جانیں بچائیں۔ امن و امان کے بعد سرکار انگریزی کی طرف سے ایسے خیر خواہوں کو بہت کچھ انعام اکرام ملے۔ لیکن اہلِ شورش یا عام لوگوں پر جیسا کہ اکثر ایسے ہنگاموں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بڑی سختیاں ہوئیں۔ بہت سے لڑائیوں میں مارے گئے۔ اُن کے علاوہ ہزاروں آدمی فوجی عدالتوں کے حکم سے بعض صورتوں میں معمولی شبہات پر سنگین سزاؤں کے مستوجب قرار پائے۔ سچ پوچھیے تو انگریزوں کا غیظ و غضب میں از خود رفتہ ہو جانا قابلِ حیرت نہ تھا جب ہندوستانی رعایا اور ان فوجی سپاہیوں نے جو خود انگریزوں کے دست پرور تھے۔ سرکار سے انحراف کر کے نہایت بے دردی سے انگریز مرد و عورت کو قتل کیا تو اس سے جس قدر اشتعال ہوتا وہ کم تھا۔ اس اشتعال میں انگریزوں نے بھی۔ جب ان کو غلبہ ہوا۔ تو دہلی، لکھنؤ، اور دیگر مقامات میں جو بغاوت کا مرکز سمجھے گئے تھے اپنے رنج و غضب کے قہرناک نمونے دکھائے اور اُن کے خوفناک انتقام کی جو روایات ہندوستان کے شہروں میں خود ہندوستانیوں میں آج تک

مشہور ہیں۔ وہ اگرچہ تاریخی طور پر مستند نہ سمجھی جائیں مگر بے بنیاد بھی نہیں ہیں[1]۔
مگر اس فتنہ و فساد اور آخر میں سرکار انگریزی کی فتح کے سب سے اہم اخلاقی اور
سیاسی نتائج یہ تھے کہ ہندوستان کی عام رعایا جو اب تک انگریزوں کی بہ حیثیت بادشاہ
و فرماں روا کوئی خاص وقعت نہ کرتی تھی، اُن سے نہایت خائف و مرعوب ہو گئی۔ بہادر شاہ
بادشاہ کی جلاوطنی اور رنگون میں نظر بندی سے خاندانِ تیموریہ کی برائے نام بادشاہی کا
بھی خاتمہ ہو گیا اور ادھر سرکار انگریزی کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آئندہ کمپنی کی بجائے
انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی بادشاہ سمجھی جائیں گی۔ (اواخر ۱۸۵۸ء سنہ ۱۲۷۴ھ)
نظمائے کمپنی اس تغیر کے خلاف تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اہلِ برطانیہ
کو اس قدر پریشان اور کمپنی کی حکومت سے بدگمان کر دیا تھا کہ نظما کی کوشش کارگر
نہ ہوئی اور اگست ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے "ہندوستان میں بہتر نظم و نسق کا قانون"
نافذ کر دیا جس کی رُو سے ممالک ہند کی عنانِ حکومت براہِ راست بادشاہ اور پارلیمنٹ
کے ہاتھ میں آ گئی۔ اور مجلس وزرا میں ایک "وزیر ہند" (سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا)

---

[1] سر چارلس ڈلک جو عرصہ دراز تک پارلیمنٹ کے رکن رہے اور مقبوضات برطانیہ کے معاملات میں اہل الرائے سمجھے
جاتے ہیں، اپنی کتاب "گریٹر برٹن" میں تحریر کرتے ہیں کہ "یہ بالکل یقینی بات ہے کہ غدر (۱۸۵۷ء) کے فرو کرنے میں صدہا
ہندیوں کو اُن انگریز افسروں نے پھانسی پر لٹکوا دیا جو کسی دیسی زبان کا ایک حرف تک نہ جانتے تھے اور نہ شہادت کو سمجھ سکتے تھے
زعفانی کے بیانات کو۔۔۔ میں نے ایک افسر سے جو ان دنوں (بنارس کے قریب) سکرول کی چھاؤنی میں متعین تھا، کہا کہ میرا
گمان ہے تم اس بات سے خائف رہتے ہو گے کہ بنارس کے لوگ تم پر حملہ نہ کر دیں تو اس کے جواب میں وہ افسر کہنے لگا کہ سچ
پوچھئے تو میں تو دل سے چاہتا تھا کہ بنارس والے حملہ کریں تاکہ ہمیں انہیں سزا دینے اور شہر کو لوٹنے کا موقع ملے جو دو صدی
سے نہیں لٹا تھا"۔ جو لوگ اس بات میں شبہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی فوجی ملازمت ہمارے سپاہیوں کو بنی نوع انسان کی جان و مال
اور آبرو کی طرف سے بالکل بے پروا بنا دیتی ہے، وہ شاید ان خطوط کو بھول گئے جو ۱۸۵۷ء میں انگلستان آیا کرتے تھے اور جن میں فوج کا
ایک اعلیٰ سردار کانپور پر فوج کشی کے حالات میں اس قسم کی اطلاعیں دیا کرتا تھا کہ "آج کا شکار بہت اچھا رہا۔ باغیوں کا نام
و نشان مٹا دیا"۔ اور باغیوں سے جنہیں پھانسی دی جاتی یا توپ سے اڑایا جاتا تھا، یہاں کوئی مسلح دشمن مراد نہ تھا بلکہ معمولی دیہاتی
جن پر بغاوت کا محض شبہ ہو جاتا تھا۔ غرض اس فوج کشی کے دوران میں، دیہات کو جلا کر اور بیگناہ لوگوں کا قتل عام کر کے وہ وہ مظالم
کئے گئے ہیں کہ ان کے سامنے محمد تغلق کے مظالم کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔۔۔" (گریٹر برٹن، مطبوعہ ۱۸۹۵ء صفحہ ۳۹ و ۴۳۳)
نیز دیکھو اڈس تھمسن صفحہ ۷۲۳

کا اضافہ کیا گیا۔ نیز مجلس **نظارت** کی بجائے "مجلس ہند" (انڈیا کونسل) قائم ہوئی کہ ہندوستان کے معاملات میں وزیر ہند کو مشورہ دے، ہندوستان کے حاکم اعلیٰ گورنر جنرل کے خطاب میں بھی "نائب شاہ" (وائسرائے) کا لفظ بڑھا دیا گیا۔

اعلانِ شاہی

آئینِ حکومت کے اس ردّوبدل کی جس اعلانِ شاہی کے ذریعے ہندوستان میں منادی کی گئی، اس کے بعض فقرات تاریخ میں یادگار ہیں:-

"اسی ضمن میں ہم (یعنی ملکۂ انگلستان) رؤسائے ہند سے اعلان کرتے ہیں کہ تمام معاہدات اور قراردادیں جو اُن کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے، یا اس کے عہد حکومت میں کی گئی ہیں، ہم نے قبول کرلیں اور آیندہ ہم بھی اُن کی پابندی کریں گے اور اُمید ہے کہ رؤسائے موصوف کی طرف سے بھی ان کی پابندی کی جائے گی"

"ہم اپنے موجودہ مقبوضاتِ مُلکی میں کسی اضافے کے خواہاں نہیں ہیں اور جس طرح اس بات کے روادار نہیں کہ ہمارے ملک یا حقوق میں کوئی شخص دست اندازی کرے اسی طرح ہم اس بات کو بھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہماری طرف سے کسی دوسرے کے ملک یا حقوق میں دست اندازی کی جائے۔

"ہم کو اقرار ہے کہ ہم پر ہمارے مقبوضاتِ ہند کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں وہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو ہماری دوسری رعایا کے حقوق سے ہم پر عائد ہوئے ہیں۔ اور ان فرائض کو ہم خداوند تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے صداقت و خلوص کے ساتھ ادا کریں گے"

"ہم پختگی سے دینِ مسیحی کی صداقت کے معتقد ہیں اور مذہب سے جو اطمینانِ قلبی حاصل ہوتا ہے اس کا بصد شکر اعتراف کرتے ہیں اور صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ نہ ہم کو یہ حق ہے نہ یہ خواہش کہ اپنے عقائد کو زبردستی اپنی رعایا سے تسلیم کرائیں۔ اس بارے میں ہمارا شاہانہ ارادہ اور مرضی یہی ہے کہ کسی شخص کی اپنے مذہبی عقائد یا شعائر کی بنا پر نہ کوئی رورعایت کی جائے نہ اُسے کسی طرح ستایا اور پریشان کیا جائے بلکہ سب کا یکساں طور پر قانون محافظ ہو۔ اور ہم تاکید کے ساتھ ہر شخص کو جو ہمارے ماتحت صاحب اختیارات ہو حکم دیتے اور ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ہماری رعایا کے کسی فرد کے مذہبی عقائد یا عبادت میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کرے ورنہ ہماری سخت ناراضی کا

مستوجب ہوگا۔
"مزید برآں ہماری مرضی ہے کہ ہماری رعایا کا ہر فرد خواہ وہ کسی مذہب و نسل سے تعلق رکھتا ہو، بلا رو رعایت اور بے تکلف ہماری ملازمت میں داخل کیا جائے جس کے فرائض ادا کرنے کی وہ، اپنی تعلیم، قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے اہلیت رکھتا ہو"
اعلان کے آخر میں قتل و خون کے مجرم یا اُن کے معاونین کے سوا ۱۸۵۸ء کے تمام ملزمین او مفسدین کو عام معافی اور امن و اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس آنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس وعدے پر کہ آئندہ ہندوستان کی حکومت کی غرض یہی یہ ہوگی کہ اہل ہند کی خوش حالی اور سُود و بہبودین کو شش کرے، یہ مشہور اعلان شاہی ختم ہوتا ہے۔

باب ششم

عہدِ شاہانِ برطانیہ

۱ - اہم تاریخی واقعات -

دنیا کے ملکوں میں بڑے بڑے انقلابات یک بہ یک رونما نہیں ہو جاتے بلکہ سراغ لگایا جائے تو وہ بہت گہرے اسباب پر مبنی اور کسی بعید زمانے سے شروع ہوتے ہیں لیکن اہل تاریخ بالعموم کسی ممتاز سیاسی واقعے کو ایک نیئے دور کا آغاز قرار دے دیتے ہیں تاکہ ان کی تاریخ معین ابواب و ازمنہ میں باقاعدہ تقسیم ہو سکے - اسی آسانی کے خیال سے اگر ہم بھی شاہان برطانیہ کے عہد کو ہندوستان کے "دور جدید" سے موسوم کریں تو کچھ نامناسب نہ ہوگا - یہ وہ دور ہے جس کی حدود ہمارے زمانے تک پھیلتی ہیں اور ہر قسم کی تمدنی اور سیاسی تغیرات جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا نتیجہ ہیں - اسی دور میں داخل ہیں - مگر جدید یا مغربی تہذیب کے اثرات پر نظر ڈالنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اس باب کی پہلی فصل میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات کو سلسلہ وار بیان کر دیں -

کیننگ کے نئے انتظامات

لارڈ کیننگ کی حکومت کے باقی تین سال زیادہ تر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی ابتری رفع کرنے میں صرف ہوئے اُس نے اودھ والوں کی شورش کی سزا میں وہاں کے قریب قریب تمام تعلقداروں کی جاگیریں ضبط کر لیں لیکن اس فعل کی خود انگلستان میں مخالفت ہوئی اور آخر کار ان میں سے اکثر جاگیریں دوبارہ ایسے لوگوں کے نام واگزاشت کر دی گئیں جن کی وفاداری سرکار انگریزی کے ساتھ مسلّم تھی -

سب سے اوّل اور ضروری مسئلہ شمالی ہند کی دیسی فوج کی تنظیم تھا کہ گزشتہ غدر میں سب سے بڑا حصّہ اسی فوج کے سپاہیوں نے لیا تھا۔ ونسنٹ اسمتھ کے قول کے مطابق ایک لاکھ اٹھائیس ہزار سپاہیوں میں سے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار آدمی انگریزوں سے منحرف اور مخالف ہو گئے تھے - ان میں سے بہت بڑی

تعداد تو آیندہ معرکوں میں ہلاک ہوئی اور بعضے دستے بچ کر نیپال کے جنگلوں میں چلے گئے اور وہیں مر کھپ گئے۔ جو لوگ ہندوستان میں روپوش ہو گئے تھے اگرچہ اعلان شاہی کی رو سے انھیں معافی مل گئی لیکن سرکاری ملازمت اب اُن کو نہیں مل سکتی تھی۔ لہذا کہنا چاہیے کہ کمپنی کی قدیم فوج کا کمپنی کی حکومت کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا اور اب از سر نو دیسی فوج بھرتی کی گئی مگر یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ شمالی ہند میں دیسی سپاہ گورہ فوج کی نسبت دو چند سے زیادہ نہ ہو۔ البتہ جنوبی ہند میں دیسی سپاہیوں کا شمار گورہ فوج سے سہ چند رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ قرار پایا کہ آیندہ دیسیوں کو توپخانے میں کوئی ذمہ داری کی خدمت نہ دی جائے گی۔ پہلے فوج کو مدراس، بمبئی اور بنگال کے احاطوں کے نام سے تین علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا مگر کچھ عرصے بعد یہ تقسیم اڑا دی گئی اور کل فوج ایک ہی سپہ سالار کے ماتحت "افواج ہند" (انڈین آرمی) کے مجموعی نام سے موسوم ہونے لگی ہے[۵۱]

نیل کا جھگڑا

۱۸۵۹ء کے اواخر (۱۲۷۵ھ) میں نیل کی کاشت کا قضیہ پیش آیا۔ دراصل بنگالے میں کچھ عرصے سے بعض انگریزوں نے زمینیں لے کر وسیع پیمانے پر نیل کی کاشت شروع کی تھی اور ہزاروں دیسی مزدوروں کو پیشگی روپیہ دے کر یہ اقرار نامے لکھوا لئے تھے کہ وہ ایک مدت معینہ تک اپنی نوکری نہ چھوڑ سکیں گے۔ پھر ان مزدوروں یا دیسی کسانوں پر انگریز زمینداروں کی طرف سے طرح طرح کی سختیاں ہونے لگیں اور وہ تنگ آ کر نوکریاں چھوڑ کر بھاگے تو اُن پر اور بھی جبر و تشدد کیا گیا۔ بنگالی زبان کا مشہور ناٹک "نیل درپن" انھی کسانوں کی افسوسناک حالت کا مرقع پیش کرتا ہے۔ بنگالے کا لفٹنٹ گورنر ڈھاکے سے واپس آتا تھا کہ ہزاروں کسان فریادیوں نے اُس کو گھیر لیا اور آخر ان کی آہ و زاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوئی۔ انگریز زمینداروں کی مظالم کی روایات صحیح ثابت ہوئیں اور اُن کے لکھوائے ہوئے اقرار ناموں کو قانوناً باطل و بے اثر قرار دیا گیا[۵۲]

---

[۵۱] اوکس ہسٹری صفحہ ۳۴۳ وغیرہ واضح رہے کہ پہلے "احاطۂ بنگال" میں تمام شمالی ہند کے صوبے داخل تھے اور اسی لئے شمالی ہند کی تمام فوجیں "بنگال آرمی" ہی کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔

[۵۲] اوکس ہسٹری صفحہ ۳۴۴، دمارش مین ۵۲۴

کے ننگ کے آخری سالِ حکومت میں پنجاب، راجپوتانہ، صوبۂ آگرہ اور کچھ کے علاقوں میں سخت قحط پڑا اور بعض اضلاع میں قریب قریب نوفیصدی آبادی فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئی![1]

لارڈ الجن اول۔

مارچ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں نیا وائسرائے (لارڈ الجن اوّل) ہندوستان آیا لیکن دو سال کے اندر بیمار ہو کر فوت ہوگیا۔ اس کے عہد کا قابلِ ذکر واقعہ صرف یہ ہے کہ سرحدی قبائل کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک انگریزی فوج روانہ کی گئی جسے بہت مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے اور یہ مقامی فساد بہ مشکل رفع دفع ہوا۔

سر جان لارنس

اسی سرحدی جھگڑے کی وجہ سے حکومت انگلستان سر جان لارنس کو وائسرائے بنانے پر آمادہ ہوگئی حالانکہ دستور یہ ہوگیا تھا کہ وائسرائے امرائے انگلستان کے طبقے کا آدمی ہو اور براہِ راست ولایت سے ہندوستان بھیجا جائے لیکن گو جان لارنس اب تک ہندوستان ہی میں مختلف ملکی عہدوں پر ملازم رہا اور طبقۂ امراء میں داخل نہ تھا۔ پھر بھی اُسکی اعلیٰ قابلیت اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بیش بہا خدمات مسلّم تھیں اور پنجاب و سرحد کے مسائل سے وہ بالخصوص نہایت عمدہ واقفیت رکھتا تھا۔ ڈلہوزی کا "قانونِ استقراض" بھی اسی کی رائے سے منسوخ ہوا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب سے اوّل اسی کی دانشمندانہ کوششوں نے دیسی ریاستوں کے حاکموں کو فرمانروائے برطانیہ کا نہایت وفادار باج گزار اور بعض صورتوں میں حلیف بنا دیا۔ یہ لارنس ہی کی تحریک سے قرار پایا کہ میسور کا راجہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو حسب معاہدہ اس ملک پر سے انگریزی قبضہ اٹھا لیا جائے چنانچہ ۱۸۸۱ء میں اس کے مطابق عملدرآمد ہوا اور حکومتِ انگریزی کی منصفانہ فیاضی کی ایک بہت اچھی نظیر قائم ہوگئی۔

افغانستان میں انہی دنوں امیر دوست محمد خاں کے انتقال (۱۸۶۳ء، ۱۲۷۹ھ) کے بعد اس کی اولاد میں جنگ چھڑ گئی تھی اور بعض انگریز اہل الرائے اسے مداخلت کا

[1] ؟ ۲۴۷ لیکس ہسٹری صفحہ

نہایت اچھا موقع سمجھتے تھے لیکن جان لارنس نے کابل کے اندرونی جھگڑوں
میں حصہ لینے سے قطعاً انکار کیا اور تجربہ گواہ ہے کہ یہی حکمت عملی انگریزی حکومت
کے حق میں مفید و سودمند تھی؛

اہل افغانستان کے ساتھ انگریزی تعلقات اور نزاع و جنگ کا حال آگے
آتا ہے۔ یہاں لارنس کا یہ کارنامہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جب سنہ ۱۸۶۵ء (سنہ ۱۲۸۱ھ)
میں اڑیسہ شمالی مدراس اور مشرقی وسط ہند کے علاقوں میں پھر قحط پڑا اور لاکھوں
آدمی اول فاقہ کشی سے اور بعد میں کثرت بارش کی دریائی طغیانیوں سے ہلاک
ہوگئے تو گو جان لارنس ان مصائب کا بروقت انسداد نہ کرسکا تاہم اس نے (۱) امداد
قحط زدگاں کے لئے جو تجاویز اور اصول قرار دیئے تھے وہ آئندہ نہایت عمدہ
دستور العمل ثابت ہوئے اور امداد قحط زدگاں کے موجودہ ضوابط و قوانین جان لارنس ہی کے
قرارداده اصول پر مرتب کئے گئے ہیں؛

لارڈ میو

جنوری سنہ ۱۸۶۹ء (سنہ ۱۲۸۵ھ) میں لارڈ میو ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا
وہ آیرلینڈ کے طبقہ امرا کا رکن تھا اور نہایت لائق و مستعد گورنر جنرل مانا جاتا ہے
دیسی رئیسوں کے ساتھ لارنس کے دوستانہ طریق عمل کو میو کی ذاتی خوبیوں سے
بہت تقویت پہنچی اور دوست محمد خاں کے فرزند امیر شیر علی کو اسی نے ہندوستان
میں مدعو کیا اور انبالے میں بڑی دھوم سے امیر موصوف کی دعوت کی۔ اسی ملاقات
کے وقت قرار پایا کہ سرکار انگریزی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور اسلحہ کی ایک مقررہ مقدار
امیر کابل کو دیا کرے تاکہ روسیوں کے مقابلے میں وہ انگریزوں کا حلیف رہے
حکومت انگلستان کی طرف سے بھی سلطنت روس پر زور ڈالا گیا کہ وہ بدخشاں پر
امیر کابل کے حقوق بادشاہی تسلیم کرے اور دریائے جیحون سے آگے اپنا عمل دخل
بڑھانے کی کوشش نہ کرے (سنہ ۱۸۶۹ و ۱۸۷۳ء)

لارڈ میو نے مالیات ہند میں بہت سی مفید اصلاحیں کیں۔ دیسی ریاستوں کے
امیرزادوں کے واسطے اجمیر، راجکوٹ، اور لاہور میں انگریزی تعلیم
کے مدرسے قائم کئے اور قید خانوں کی اصلاح کی، دھن میں خود جزیرہ انڈمان پہنچا تھا
وہیں ایک سرحدی پٹھان کے ہاتھ سے جسے کسی انگریزی عدالت سے عبور دریائے شور

کی سزا ملی تھی، مارا گیا[۱] (جنوری ۱۸۷۲ء ۱۲۸۸ھ)

میئو کے جانشین لارڈ نارتھ بُرک کا زمانہ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ) اہم تاریخی واقعات سے خالی ہے۔ لیکن یہ تجویز کہ فرماں روائے انگلستان کے قیصر ہند ہونے کا شاہانہ طریق پر اعلان کیا جائے اسی والیسرائے نے کی تھی جس کی پارلیمنٹ نے بہت بیچار دو قدح کے بعد منظوری دی اور لارڈ لٹن کے عہد میں اس پر عمل ہوا، یعنی سلاطین ہند کے قدیم پائے تخت دہلی میں ہندوستان کے رؤسا اور امرا کو جمع کر کے ایک بڑے دربار میں یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ سے ملکۂ وکٹوریہ "قیصرۂ ہند" کے لقب سے ملقب کی جائیں گی (جنوری ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ)

مگر اس دربار قیصری کی دھوم دھام اور خوشی کو جنوبی ہند کے خوفناک قحط نے بے لطف کر دیا اور سال آئندہ اس قحط کے اثر سے وسط ہند اور شمالی ہند کے علاقے بھی محفوظ نہ رہے۔ انگریزی عہدہ داروں نے قحط زدہ رعایا کو مدد پہنچانے کی بہت کچھ کوشش و تدبیر کی انگلستان سے بھی لوگوں نے چندہ کر کے روپیہ بھیجا کیونکہ قحط کے سبب سے مہیب اثرات ہندوستان کے انھی علاقوں میں رونما ہوئے تھے جو براہ راست انگریزی حکومت کے قبضے میں تھے۔ مگر باوجود تمام انسدادی اور امدادی تدابیر کے اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف انگریزی علاقے میں تقریباً پچاس لاکھ آدمی خوراک میسر نہ آنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے بُری غذا نے جن لوگوں کو امراض وبائی میں مبتلا کر کے عدم کا راستہ دکھایا ان کا شمار اس کے علاوہ ہے[۲]

اس بلائے آسمانی کے شدائد سے ابھی تک ملک سنبھلنے نہ پایا تھا کہ افغانستان کی جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے بعض انگریز مصنفوں اور خاص کر اُس زمانے کے اخبار نویسوں نے لارڈ لٹن پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی بڑی سلطنت اور قوت حاصل کرنے کے بعد

---

[۲] اوکس ہیں صفحہ ۹۱ء ۔ نیز دیکھو ٹامسن کی مختصر تاریخ ہند صفحہ ۲ ۳۹ اور کیمن جلد دوم صفحہ ۳۰۷ جس میں امراض وبائی سے مرنے والوں کو ملا کر اتلاف جان کا کل شمار ستر لاکھ نفوس بتایا گیا ہے۔

مزید ممالک فتح کرنے کا شوق، قدرتی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے زمانے میں جبکہ ہند کی حکومت پر ایک ایسا شخص مامور ہو جو خود بھی شاعر تھا اور اس جادو بیان افسانہ نگار کا فرزند بھی تھا جنے ایک قصّے میں قدیم شہر پومپی آئی کے کھنڈروں کو اپنی اصلی دیرینہ شان میں ظاہر کر کے اُن میں صدہا برس پہلے کی چہل پہل دکھائی تھی۔ ایسے شخص کو اگر ایشیا میں ایک عظیم الشان برطانوی سلطنت قائم کرنے کے خواب نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی دوسرے کابل سلاطین مغلیہ کا دو صدی تک صوبہ رہ چکا تھا۔ سلطنت روس کی اندیشہ ناک پیش قدمی دیکھکر بھی انگلستان کے بعض حامیان کشور کشائی، ہندوستان کی حفاظت کے لئے اس ملک پر قبضہ یا کسی حد تک عمل دخل رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ امیر شیر علی کے ساتھ لارنس و میئو کے دوستانہ روابط کو نارتھ برک کے ناگوار طرز عمل نے پہلے ہی درہم برہم کر دیا تھا اور اب امیر موصوف علانیہ روسیوں کی طرف مائل نظر آتا تھا۔[1] پس لارڈ لٹن کو وزرائے انگلستان سے اس بات کی منظوری لینے میں کچھ بھی دشواری پیش نہ آئی کہ امیر کابل کو یا تو انگریزوں کی دوستی قبول کرنے پر مجبور کیا جائے وگرنہ اس کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ سلطنتِ انگریزی کو اس کی جانب سے کوئی اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔

لیکن امیر شیر علی اگر انگریزوں سے دوستی رکھنے پر آمادہ بھی تھا تو ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں انگریزوں کے کوئٹہ پر قبضہ کر لینے سے نہایت برہم ہو گیا۔ بلوچستان کے شمال کا یہ مقام خان قلات کی ریاست میں داخل تھا اور اسی سے مصالحانہ گفتگو کر کے لیا گیا۔ لیکن جنوب مغربی افغانستان کے مرکزی شہر قندھار سے وہ صرف چند منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور کوئٹہ سے درۂ بولان گویا بالکل زد میں آجاتا ہے۔ پس انگریزی فوجوں کا ایسے مقام پر پہنچ جانا امیر کابل کو قدرتاً سخت ناگوار و موجب تشویش ہوا۔

---

[1] اوکس ہس صفحات ۴۴، ۵۱، ۵۴۔

اسی واقعے کے بعد امیر شیر علی نے سلطنت روس سے باقاعدہ دوستی کے عہد و پیمان کئے اور ۱۸۷۸ء (۱۲۹۵ھ) میں روسی سفیر کا کابل میں بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔
یہ خبر سن کر لارڈ لٹن نے بھی ایک سفیر کابل روانہ کیا تھا مگر امیر نے اس ناخواندہ مہمان کا استقبال کرنے سے انکار کیا اور اسی اہانت کی بنا پر سرکار انگریزی نے نومبر ۱۸۷۸ء (اواخر ۱۲۹۵ھ) میں کابل کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ساتھ ہی درہ خیبر، وادیٔ خرم اور کوئٹہ سے تین انگریزی فوجیں افغانستان پر بڑھیں اور معمولی مزاحمت کے بعد جلال آباد و قندھار پر قابض ہو گئیں۔ خود امیر شیر علی اس لشکر کشی کی خبر سنتے ہی کابل سے نکل گیا اور بلخ میں روسی امداد کا منتظر تھا کہ بیمار ہو کر وفات پائی اور اس کے فرزند یعقوب خاں نے کچھ مجبوری سے اور کچھ ذاتی اغراض کی بنا پر انگریزوں سے صلح کر لی (عہد نامہ گنڈمک مرتبہ مئی ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) جس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ خیبر و بولان وغیرہ دروں پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا اور ایک مستقل نائب (منسٹر، یا ریزیڈنٹ کابل میں متعین کر دیا جائے گا اور حکومتِ کابل اپنے بیرونی معاملات میں سرکار انگریزی کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کر سکے گی۔ لارڈ لٹن کو قندھار پر قبضہ رکھنے یا اسے حکومت کابل سے علیحدہ کر دینے کی خواہش تھی لیکن یعقوب خاں کے کہنے سننے سے یہ شرط معاہدے میں تحریر نہیں کی گئی تھی۔[۱]
اس عہد نامے کے بموجب میجر کیوگ نری کو کابل میں سفیر بنا کر بھیجا گیا لیکن لوگوں کے بڑے تیور دیکھ کر یعقوب خاں نے اسے کابل پہنچتے ہی اطلاع دیدی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ کیوگ نری نے اس بات کی چنداں پروانہ کی اور آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا یعقوب خاں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یعنی افغانی فوج کے بعض دستوں نے قلعے پر جہاں انگریزی سفیر مقیم تھا یک بہ یک حملہ

[۱] ادکس ہاصفحہ ۷۵۲۔ وغیرہ

گیا اور سفیر اور اس کے سب ساتھی مارے گئے۔ (ستمبر ۱۸۷۹ء) [۱] انگریزی افواج
قندھار میں موجود تھیں۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی کابل پر بڑھیں اور تھوڑی
سی کشمکش کے بعد اس شہر پر قابض ہوگئیں [۲]۔ امیر یعقوب خاں خود انگریزی لشکر گاہ
میں چلا آیا تھا لیکن کابل پر قابض ہو کر انگریزوں نے اس کی معزولی کا اعلان کر دیا
اور تجویز کی گئی کہ اس ملک کو کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کر دیا جائے [۳]
اس تجویز کے مطابق قندھار کو علیحدہ ریاست بنا کر، امیر شیر علی کے ایک
رشتہ دار کو وہاں کا رئیس منتخب کیا گیا اور گو شمالی افغانستان پر مستقل قبضہ کرنا
ابھی تک مخدوش نظر آتا تھا لیکن اس حد تک وزرائے برطانیہ بھی آمادہ تھے کہ
قندھار کو کم سے کم باج گزار ریاست کی طرح زیر نگیں رکھا جائے اور وہاں
کچھ عرصے انگریزی فوج رکھ کر شہر قندھار تک ہندوستانی ریل کا سلسلہ وسیع
کر دیا جائے [۴] مگر اوّل تو اسی زمانے میں وزارت برطانیہ میں تغیر ہوا جس کی
وجہ سے لارڈ لٹن بھی مستعفی ہو گیا (اپریل ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ) دوسرے افغانستان
میں امیر شیر علی کے ایک دوسرے بیٹے ایوب خاں نے بڑی قوت
بہم پہنچالی اور خاص قندھار پر حملہ کیا جہاں انگریزوں کا سب سے زیادہ زور
تھا [۵]۔ واضح رہے کہ اس تمام مدت میں کہ انگریزی فوجیں کابل و قندھار،
غزنی و جلال آباد وغیرہ قلعوں پر قابض رہیں، آزادی پسند افغان خاموش
نہیں رہے تھے بلکہ جب کبھی انگریزی فوجیں اپنے مورچوں سے باہر آتیں،
تو اکثر ان کی افغانوں سے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کو قبضۂ کابل
میں اس قدر مالی اور جانی نقصانات اٹھانے پڑے تھے کہ ایک طرف تو حکومت

---

[۱] ونسنٹ اسمتھ نے لکھا ہے کہ یعقوب خاں نے خود اصرار کیا تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ کابل میں آکر رہے (صفحہ ۷۵۲)
لیکن اگر یہ صحیح ہو تو بھی اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کیونکہ روایت کا اصلی اور ضروری جزو یہ ہے کہ اگر پہلے
اصرار کیا تھا تو بعد میں یعقوب خاں نے خطرے کی اطلاع بھی دیدی تھی (مارش مین، صفحہ ۵۳۶)

[۲] مارش مین صفحہ ۵۳۸۔ اوکس ہ ۷۵۳

[۳] مارش مین صفحہ ۵۳۸۔ اوکس ہ ۷۵۴

ہندوستان جنگی مصارف کے بار سے دبی جاتی تھی اور دوسری طرف کابل میں جو ہندوستانی فوجیں مقیم تھیں، ان میں سخت بے دلی پیدا ہو گئی تھی[1]۔ باایں ہمہ افغانی جنگجو بالکل بے سروسامان اور نہایت غیر منتظم حالت میں تھے اور اسلیئے انگریزوں کے آتشی اسلحہ اور کثرتِ سپاہ کے مقابلے میں ان کی جانبازی کارگر نہ ہوتی تھی۔ پس جس وقت ایوب خاں نے ہم وطنوں میں ایک حد تک انتظام و اتحاد قائم کر لیا تو جنگ کی صورت بدل گئی اور قندھار سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر انگریزی سپاہ کو ایک بڑے میدانی معرکے میں شکست کھا کے پسپا ہونا پڑا[2] (جنگ میوند۔ جولائی ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ)۔

کابل سے فوراً انگریزی فوجیں مدد کے واسطے آ پہنچی تھیں لیکن ادھر تو ان واقعات سے قبضۂ کابل کی دشواریاں بڑھ گئیں اور ادھر حکومت برطانیہ اور نیز نیئے وائسرائے لارڈ رپن کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اس جھگڑے سے پیچھا چھڑا لیا جائے۔ لہٰذا جب انہی دنوں امیر شیر علی کا بھتیجا امیر عبدالرحمٰن غالباً روسیوں کی امداد و تحریک سے، کابل پر بڑھا اور اپنی بادشاہی کا دعویدار ہوا تو انگریزوں نے بھی ایوب خاں اور افغانستان کو اُس کے حوالے کر کے خود اس مُلک سے نکل آنا غنیمت سمجھا اور اپریل ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸ھ) تک کابل و قندھار کے سب علاقے خالی کر کے انگریزی فوجیں واپس چلی آئیں۔

اس طرح دو تین سال کی جنگی تدابیر اور جدّ و جہد کا وہ نتیجہ تو نہیں نکلا جسکی لارڈ لٹن کو آرزو تھی یعنی کابل و قندھار ایک طرف وادی خرّم و خیبر سے بھی انگریزی افواج کو واپس بُلانا پڑا اور ملک افغانستان کو چند ریاستوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ تاہم ان لڑائیوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ریاست قلات انگریزوں کے زیر اثر آگئی اور کوئٹہ اُن کا مستقل مرکزِ جنگ بن گیا جہاں سے قندھار پر فوج کشی کرنا آسان ہے۔ نیز وادیٔ خرّم

---

[1] مارش مین صفحہ ۵۳۸ و ۵۴۰ وغیرہ

[2] اوکسس مین صفحہ ۵۳، ۷ وغیرہ

گویا اس کی زد میں ہے چنانچہ چند سال بعد آخر اس پر بھی سرکار انگریزی کا فوجی تسلط ہو گیا اور کوئٹہ کی طرح وہاں ایک مستحکم چھاؤنی (یہ مقام پار چنار) قائم کر دی گئی [۱]۔

رپن کی ہر دلعزیزی

افغانستان کی جنگ کے خاتمے اور امیر عبدالرحمن کے ساتھ مصالحت نے یقیناً ہندو انگلستان کے بہت سے اہل الرائے کو لارڈ رپن کا شکر گزار بنا دیا۔ لیکن ہندوستان میں اس کی ہر دلعزیزی کے، جس پر ونسنٹ اسمتھ اور اس کے ہم خیال انگریز حقارت آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہیں [۲]، اور بہت سے اسباب تھے۔

اوّل تو اسی زمانے میں ریاست میسور وہاں کے راجہ کو واگذاشت کی گئی اور انگریزی عملداری جو پچاس برس سے میسور میں قائم تھی اٹھا لی گئی (۱۸۸۱ء سنہ ۱۲۹۸ھ) دوسرے لارڈ لٹن دیسی اخبارات پر جو شدید قیود عائد کر گیا تھا رپن کے زمانے میں منسوخ کر دی گئیں (۱۸۸۲ء) تیسرے لارڈ رپن پہلا انگریز حاکم ہے جس نے اپنی ہندی رعایا کو "حکومت خود اختیاری" کے نئے راستے پر ڈالا اور متعدد قوانین و ضوابط بنا کر مجالس بلدیہ و ضلعیہ (یعنی میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈز) میں اہل ہند کے دخل و اختیارات کو وسیع کیا (۱۸۸۳ء و ۱۸۸۴ء سنہ ۱۳۰۱ھ) پس اگر ان مراعات سے اہل ہند لارڈ رپن کے گرویدہ ہو گئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

اہل ہند کی احسان مندی کے مقابلے میں لارڈ رپن کے بعض ہم وطن اُس کی ان فیاضیوں کو خوف و بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جب اسی زمانے میں ایک نئے قانون کا مسودہ پیش ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ اضلاع کی ہندوستانی عدالتوں کو انگریزوں کے مقدمات میں بھی تحقیقات اور فیصلہ

---

[۱] اوکسن ہس صفحہ ۷۵۴ ۔ مارش مین ۔ ۔ ۴۰ ۵

[۲] ونسنٹ اسمتھ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لارڈ رپن بالکل معمولی قابلیت کا آدمی تھا اور اپنے وطن میں سوائے اس کے کہ ایک تجربہ کار و مستعد اہل کار سمجھا جائے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکا، (اوکسن ہس صفحہ ۷۵۵) لیکن لائق موقف کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ ایک غیر قوم کی رعایا میں فقط دماغی قابلیت مقبول نہیں بلکہ کسی حاکم کی ہر دلعزیزی کا اصلی سبب عدل گستری، نیک نفسی اور فیاضی کی صفات ہوا کرتی ہیں۔

کرنے کا اختیار دیا جائے، تو ہندوستان کے انگریزوں میں لارڈ رپن کے خلاف ایک شور مچ گیا۔ اصلی مسودہ، کونسل کے رکنِ شعبہ قانون (مسٹر البرٹ) نے مرتب کیا تھا اور اسی کے نام سے تاریخ میں "البرٹ بل" کہلاتا ہے لیکن معترضین کو سب سے زیادہ غصّہ لارڈ رپن پر آتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہی منصف مزاج وائسرائے چاہتا تھا کہ قانون کی نظر میں گورے کالے کا فرق باقی نہ رہے اور ہندوستان میں رہنے والے (غیر سرکاری) انگریزوں یا "برطانیہ کی فرنگی رعایا" کو جو مخصوص امتیاز حاصل ہے کہ اُن کے مقدمے کی سماعت صرف انگریز حاکمِ عدالت ہی کر سکتا ہے، اُسے دُور کر دیا جائے۔ لیکن اضلاع بنگالہ میں نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں نے "البرٹ بل" کی اس شدّت سے مخالفت کی کہ آخر سرکار کو یہ مسودہ قانون واپس لینا پڑا اور قانون نافذ الوقت میں صرف خفیف ترمیم کر دی گئی۔ (۱۸۸۳ء = ۱۳۰۰ھ)

نیشنل کانگریس کی تاسیس

ہندوستان کے انگریزوں کی مذکورۂ بالا مخالفت میں دیسی اخبارات اور ہندوستانی اہل الرائے نے لارڈ رپن کا ساتھ دیا تھا اور اس بحث مباحثے میں فریقین ایک دوسرے کے نہایت مخالف و معاند ہو گئے تھے۔ پھر جب کامیابی انگریزوں کے فریق کو ہوئی تو اہلِ ہند میں اور بھی ناراضی کا احساس پیدا ہوا اور انہی جذبات کو آئینی حدود کے اندر رکھنے کی غرض سے چند آزاد خیال انگریز عہدہ داروں ہی نے اہلِ ہند کو ایک "سیاسی انجمن" بنانے کا مشورہ دیا۔ جو "ممالکِ ہند کی قومی انجمن" یا "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس کا پہلا اجلاس جنوری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں منعقد ہوا۔ اس انجمن کی تاسیس کا اصلی مُدعا یہ تھا کہ ملک کے ہر حصّے سے ہندوستانی اہل الرائے سال کے سال ایک مقام پر جمع ہوں، اپنے قانونی حقوق کے تحفظ کی تدابیر سوچیں اور تمام اہلِ مُلک کی جانب سے اپنی آواز سرکار انگریزی کے اعلیٰ حکام تک پہنچائیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس انجمن کے سالانہ جلسوں نے اس سے بھی بڑھ کر جو کام کیا وہ یہ تھا کہ خود اہلِ ہند کو اپنے سیاسی حقوق سے آگاہ کیا اور اُن میں سیاسی بیداری اور قومی خودداری پیدا کر دی۔

لارڈ ڈفرن
سنہ ملا

رپن کے جانشین لارڈ ڈفرن کے زمانے میں دوبارہ افغانستان میں مداخلت کا مسئلہ پیش آیا کیونکہ اب سلطنت روس کے ڈانڈے واقعی ملک افغانستان کی سرحدوں سے آملے تھے۔ روسی ریلیں عاشق آباد و سرخس تک جاری ہوگئی تھیں اور مرو کے روسی گورنر (علی خانوف) کے سپاہی درۂ ذوالفقار اور پل خشتی پر مورچے بنا رہے تھے جو امیر کابل کی سرحد سے بالکل متصل مقامات ہیں۔ پھر کابلی سپاہیوں کی ایک مقام (پنج دہ) پر ان سے لڑائی بھی ٹھن گئی جسے کابلی اپنی سرحد کے اندر بتاتے تھے لیکن روسیوں نے حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا (۱۸۸۵ء = ۱۳۰۲ھ)

اس واقعے نے ہند و برطانیہ کے انگریز مدبرین کو نہایت مشتعل کیا اور سلطنت روس کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کی جانے لگیں لیکن اگر لارڈ ڈفرن کے بعض مشیر افغانستان میں فوج بھیجنے پر آمادہ بھی تھے تو خود امیر عبدالرحمن خاں نے اس کو گوارا نہیں کیا بلکہ راولپنڈی میں لارڈ ڈفرن سے مل کر صاف صاف جتا دیا کہ افغانستان خواہ تباہ و تاراج ہوجائے، انگریزی فوج کا افغانستان میں آنا ہمیں کسی صورت میں منظور نہ ہوگا۔ باقی سرکار انگریزی اگر افغانستان کی روسیوں کے مقابلے میں پشت پناہ ہونا چاہتی ہے تو جس قدر ہوسکے روپیہ اور جنگی ساز و سامان سے اہل افغانستان کی مدد کرے تاکہ وہ خود روسیوں کی پیش قدمی روک لیں۔ لارڈ ڈفرن کو بھی مصلحت اسی طریق عمل میں نظر آئی اور امیر عبدالرحمن خاں بارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی امدادی رقم کی تجدید و توثیق اور کثیر ساز و سامان جنگ کے ساتھ خوش خوش کابل واپس گیا اور جب جا بجا اس نے "دولت خداداد و دولت برطانیہ" کے اتحاد کا عام اعلان کردیا۔ سرحد کابل و روس کا تنازعہ کچھ عرصے بعد فریقین کی باہمی گفتگو سے مصالحانہ طریق پر طے ہوگیا[۱]

الحاق

سرحد ہندوستان کے دوسرے سرے پر برما کا ملک گھٹتے گھٹتے اب ایک

[۱] ادکس سر ۵۹، ۷۔ مارشمین ۸، ۴ و ۵۴۶ وغیرہ

چھوٹی ریاست رہ گیا تھا مگر وہاں کا راجہ (تھی بو) انگریزوں کے ساتھ گویا موروثی عداوت رکھتا تھا اور اس نے انہی دنوں فرانسیسیوں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا تھا، ڈفرن کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اتفاق سے اسی زمانے میں راجہ نے ایک انگریزی کمپنی پر کئی لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔ اور جب سرکار انگریزی نے اس سے شکایت کی تو معمولی جواب دے کے معاملے کو ٹال دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے ڈفرن اس ریاست کا خاتمہ کرنے کا پہلے سے ارادہ کر چکا تھا لہذا انگریزی کمپنی کے معاملے کو لڑائی کا سبب قرار دے کر اس نے جنگ کا اعلان کر دیا (۱۸۸۵ء ۱۳۰۳ھ) انگریزی افواج کی پیشقدمی کی اہل برما کوئی بڑی مزاحمت نہ کر سکے اور چند ہفتے میں پایہ تخت مانڈلے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ راجہ تھی بو کو معزول کر کے ہندوستان لے آئے اور جنوری ۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں برما کے سلطنت انگریزی میں الحاق کا اعلان کر دیا گیا۔

اہل برما میں افغانوں کی طرح جنگ و جانبازی کا عام جوش نہ تھا اور نہ ان میں کوئی بہادر سردار ایسا پیدا ہوا جو اپنے ہم وطنوں کو قومی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلے پر آمادہ کر دیتا۔ تاہم برمی فوج کے برطرف شدہ سپاہی اور قزاقوں کے بعض گروہ بہت دن تک انگریز حکام کو پریشان کرتے رہے اور کامل امن و تسلط الحاق کے پانچ سات سال بعد قائم ہو سکا۔ پھر ۱۸۹۷ء (۱۳۱۴ھ) میں شمالی اور جنوبی برما کو ملا کر ہندوستان کا ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔

ڈفرن کے عہد کے دو واقعات اور قابل ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ ریاست گوالیار سے جھانسی لے کر مُرار کا مقام اور گوالیار کا مشہور قلعہ اس ریاست کے حوالے کر دیا گیا۔ اور دوسرے اوائل ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) میں برطانیہ کی ہر دلعزیز ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی پنجاہ سالہ "جوبلی" (یا سالگرہ) منائی گئی۔ اور ہندوستان کے ہر شہر میں دھوم دھام کے جلسے ہوئے۔

سرحدی لڑائیاں

الحاق برما کے بعد، بقول ونسنٹ اسمتھ، کوئی اور علاقہ تو ایسا باقی نہیں رہا تھا کہ جسے لیکر ہندوستان کے انگریز حکام اپنے مقبوضات میں مزید

توسیع کرتے۔ البتہ سرحد کابل کی طرف بہت سے جنگی مسائل تصفیہ طلب تھے اور "کشور ستانی"، کا ایک محدود میدان موجود تھا لیکن اس بارے میں ڈفرن کے جانشین لارڈ لینس ڈون پر ہندوستانی اخبار نویسوں اور کانگریس والوں نے جو اعتراضات کی بوچھار کی تھی، اس میں بظاہر ایک حد تک بیجا عیب جوئی اور نافہمی کا بھی دخل تھا۔ درحقیقت امیر عبدالرحمن خاں کی قوت مستحکم ہونے کے بعد وقت کے وقت اس بات کا کوئی قرینہ نہ رہا تھا کہ ملک افغانستان پر انگریزوں کا براہ راست یا بالواسطہ تسلط قائم ہو جائے گا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ اپنی ہندوستانی سرحد کو ایسے طریقے سے معین و مستحکم کیا جائے کہ اگر دولت کابل انگریزوں کی محکوم نہ ہو سکے تو بھی انگریزوں کے حملے سے ایک حد تک خائف و اندیشہ مند رہے۔ لینس ڈون اس سرحد کو کوہستان سلیمان کے مغربی پہلو پر قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ درہ خیبر کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکے اور اگرچہ اس منصوبے میں آزاد سرحدی قبائل سے لڑائیوں کا اندیشہ تھا، نیز جذبہ "کشور ستانی"، کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بایں ہمہ نہ صرف سلطنت انگریزی کی شان بلکہ دفاعی ضروریات کو پیش نظر رکھا جائے تو غالباً تسلیم کرنا پڑے گا کہ لینس ڈون کی تجویز قابل تعریف تھی نہ کہ لائق اعتراض۔ اسی طرح بلوچستان میں انگریزی نفوذ کو ترقی دینے کے متعلق جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ بھی چنداں دقیع نہیں معلوم ہوتیں۔ سچ پوچھیے تو کوئٹہ پر انگریزی قبضہ ہونے کے وقت ہی سے یہ علاقے سرکار انگریزی کے زیر اثر ہو گئے تھے۔ البتہ یہ مسئلہ صاف نہیں ہوا تھا۔ اور افغانستان میں ایک مستقل حکومت قائم ہونے کے بعد یہ کمی یا بے قاعدگی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی لینس ڈون کو اس کا دور کرنا ضروری معلوم ہوا اور اس نے امیر کابل سے گفتگو کے بعد اس بلوچستانی علاقے کے باقاعدہ انگریزی تسلط میں ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس "الحاق" میں بہت کم نئے اضلاع شامل تھے ورنہ زیادہ تر وہی علاقہ سرکار انگریزی کے پاس رہا جو لارڈ لٹن کے زمانے سے انگریزوں کے اثر میں آچکا تھا۔

بہر حال، جہاں تک امیر کابل سے معاملت کا تعلق تھا، لارڈ لینس ڈوون کی کوششیں خاطر خواہ کامیاب ہوئیں۔ ڈورنیڈ اور سینڈیمن جیسے لائق ہاتھوں کی مدد سے بلوچستانی اور شمالی سرحد اچھی طرح معین کرالی گئی۔ امیر عبدالرحمن خاں نے کوئٹے سے چالیس پچاس میل آگے تک انگریزوں کا قبضہ تسلیم کرلیا اور کوہستان سلیمان کے سرحدی قبائل کے علاقے پر جو حاکمانہ حقوق، دولت کابل کو حاصل تھے اُن سے بھی دست بردار ہوگیا۔ یہ "حقوق"، دراصل محض رسمی تھے ورنہ کابل ہو یا ہندوستان کسی ملک کی حکومت بھی ان آزاد جنگجو قبائل کو آسانی سے کبھی اپنے قابو میں نہیں لاسکی تھی۔ لہٰذا اس پہاڑی علاقے کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے، دولت کابل کا کوئی نقصان نہیں ہوا مگر اسکے معاوضے میں امیر نے اپنی سالانہ امدادی رقم میں ۶ لاکھ کا اضافہ کرالیا۔

لیکن سرکار انگریزی کو اصلی زحمت اور پریشانی ابھی سرحدی قبائل کو محکوم کرنے میں پیش آئی۔ لینس ڈوون تو چھٹے سال عہدے سے دستکش ہوکر ولایت روانہ ہوگیا (۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۱ھ) اور بلوچستان کا جہاں تک تعلق ہے، اُدھر کے بلوچ قبائل بھی خاصی طرح انگریزوں کے مطیع وزیر نگیں ہوگئے مگر شمال میں جب مذکورۂ بالا تجویز کے مطابق خیبر اور کوہستان سلیمان کی بلندیوں پر انگریزی چوکیاں قائم کی گئیں، تو وہاں کے "افریدیوں" سے جنگ وجدال کا وہ سلسلہ چھڑ گیا جو درحقیقت آج تک ختم نہیں ہوا ہے۔

چنانچہ اول تو لینس ڈاؤن کے جانشین لارڈ ایلجن (ثانی)، (۹۴ء تا ۱۸۹۹ء مطابق ۱۳۱۷ھ) ہی کو وسیع پیمانے پر ان سرحدیوں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی جنھوں نے ۱۸۹۷ء (مطابق ۱۳۱۵ھ) میں چترال سے بلوچستان تک لڑائی کی آگ بھڑکا دی تھی اور چک درا، سمر گڑھی، ٹوچی وغیرہ کئی پہاڑی مقامات پر انگریزی فوجوں کو سخت نقصان پہنچائے تھے۔ اس لڑائی کا سلسلہ جسے جنگ تیراہ یا "مہم تیراہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دو سال تک جاری رہا۔ اول تو ان پہاڑی اور سرد مقامات کو فتح کرنا کچھ آسان نہ تھا دوسرے انگریزوں کے مقابلے میں عمدہ اسلحہ اور قواعد جنگ کی کمی کو افریدیوں نے

اپنے مذہبی جوش اور جانبازی سے خاصی طرح پورا کر دیا تھا اور جا بجا وہ ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزی فوجوں کی ہمت پست ہوگئی۔ پھر جان و مال کے کثیر نقصانات کے بعد اکثر قبائل مغلوب یا صلح پر آمادہ ہوگئے اور ۱۸۹۸ء میں "جنگ" کے حسب دلخواہ ختم ہونیکا اعلان ہوا تو بھی درحقیقت ان سرحدی پہاڑیوں کی شورہ پشتی میں فرق نہیں آیا۔ اور تازہ ترین تاریخ کے انگریز مؤلف کو اعتراف ہے کہ "ان قبائل کی کامل اطاعت آج بھی اسی قدر دور و بعید نظر آتی ہے جتنی کہ ہمیشہ سابق میں دور تھی[1]" حتی کہ چند سال بعد لارڈ کرزن کو (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء = ۱۳۲۲ھ) یعنی ڈون کے جنگی منصوبے میں ترمیم کرنی پڑی اور "مصالحانہ نفوذ" کا وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی جو بلوچستان میں سینڈمین نے اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس وائسرائے نے (سرحدی) انتظام کے اصول یہ قرار دیئے کہ "بڑھی ہوئی فوجی چوکیوں سے انگریزی فوج واپس ہٹالی جائے۔ قبائل سرحدی کے علاقے کی حفاظت کے واسطے خود قبائل ہی کی فوجوں سے کام لیا جائے۔ اور ان کی امداد و حفظ ماتقدم کی غرض سے، انگریزی فوجیں ان (قبائل کی فوجوں) کے عقب میں فراہم رکھی جائیں اور ان عقبی مقامات میں ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا جائے"

"اس حکمت عملی کی بدولت سرحدی قبائل کی ایک معقول جمعیت (فرنٹیر ملیشیا) کو فراہم و مرتب کرنا پڑا لیکن اس کا کامیاب ہونا ہی اس کی خوبی کا ثبوت ہے۔ اور لارڈ کرزن کے زمانے میں صرف ایک لڑائی محسودیوں سے پیش آئی۔ سو اسے بھی اہمیت چھپانے کی غرض سے (سرکاری طور پر) فقط "ناکہ بندی" کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا[2]"

لارڈ کرزن کی غیر معمولی

یہ وائسرائے جس نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا مذکورۂ بالا انتظام کیا، ابھی تک (۱۳۴۱ھ) زندہ اور سلطنت برطانیہ کے ارباب حل و عقد میں داخل ہے اور بے شبہ ذاتی قابلیت اور ذہانت کے اعتبار سے اسے ہندوستان کے سب سے

[1] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۶۶، جنگ تیراہ کے حالات میں دیکھو کیمبرج جلد دوم ۳۵۶ وغیرہ
[2] اوکس ہسٹری صفحہ ۷۷۲۔ انھی سرحدی قبائل کو خاطر خواہ قابو میں لانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے "شمال مغربی سرحدی صوبہ" علیحدہ بنایا تھا (۱۹۰۱ء) جس کا چیف کمشنر براہ راست وائسرائے کے ماتحت ہوتا ہے۔

مشہور وائسراؤں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ بایں ہمہ اہل ہند عام طور پر لارڈ کرزن سے ناراض رہے اور اس ناراضی کی بہت سی وجوہ تھیں :-

(۱) اول تو انہی آٹھ برس میں ہندوستان کے لوگوں کو قحط و طاعون کی آسمانی بلاؤں سے وہ تکلیف و مصیبت اٹھانی پڑی کہ شاید پہلے کبھی پیش نہ آئی ہوگی تاریخی طور پر شاہ جہانگیر کے عہد میں وبائے طاعون کے پھیلنے کا ثبوت ملتا ہے اور اُس موقع پر بھی اِس وبا نے لکھوکھا آدمیوں کی جان لی اور ہندوستان خاص کے اکثر مقامات میں سخت تہلکہ ڈال دیا تھا مگر یہ وبا چند سال میں دفع ہوگئی۔ برخلاف اس کے لارڈ الجن کے زمانے میں جب طاعون (بیوبنک پلیگ) کا بمبئی سے آغاز ہوا (۱۸۹۶ء ۔ ۱۳۱۳ھ) وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر حصے میں پھیل گیا اور آج پچیس چھبیس برس بعد بھی اس کے بالکل دفع ہوجانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن شاید طاعون سے بھی بڑھکر پریشان کن ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء کے خوفناک قحط تھے جنھوں نے "ہندوستان خاص" اور وسطِ ہند کے علاقوں میں سخت تباہی اور ہراگت پھیلادی۔ ان قحطوں میں لاکھوں آدمی بھوک سے مرے جنکی اس قدر حالت خراب نہ تھی وہ بھی فاقہ کشی اور گرانی کی تکلیف سے محفوظ نہ تھے اور اِن مصائب نے عام طور پر اہل ہند میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کردی تھی ۔

(۲) مگر خود وائسرائے سے لوگوں کی ناخوشی کا پہلا سبب وہ کوششیں تھیں جو خلیج فارس اور تبت میں انگریزی اثر بڑھانے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کیں۔ ان میں پہلی کوشش تو برطانیہ کی بحری قوت اور حکومتِ ایران کی کمزوری کی وجہ سے جنگ وجدال کی نوبت آئے بغیر خاصی کامیاب ہوگئی۔ لیکن تبت پر جو فوجی مہم بھیجی گئی تھی اُسے وہاں کے پائے تخت لاسا تک پہنچنے میں دو ایک مقابلے کرنے پڑے اور اگرچہ لاسا پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن آخر میں سلطنت چین سے جنگ چھڑ جانے کے اندیشے سے مہم کو واپس بلانا پڑا اور ونسنٹ اسمتھ کے بقول "جغرافی معلومات حاصل کرنے کے سوا اس غیر ضروری مہم بھیجنے کا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ (۱۹۰۴ء ۔ ۱۳۲۱ھ)

مہم تبت تقسیم بنگال وغیرہ۔

ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی لارڈ کرزن کے زمانے میں سرکار انگریزی کی مداخلت اور نگرانی بڑھ گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ برار کا دوامی پٹہ اسی والیسرائے کے عہد میں ہوا۔ مگر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ جو بات ناگوار گزری وہ لارڈ کرزن کا نیا "قانونِ جامعات" (یونی ورسٹیز ایکٹ) مجریہ ۱۹۰۴ء (۱۳۲۱ھ) ہے جس نے تعلیمی معاملات میں سرکار کے دخل و اختیار کو بہت بڑھا دیا اور ہندوستانی اہل الرائے نے عام طور پر اس قانون کو اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے منافی اور مخالف قرار دیا۔ ابھی یہ ناراضی کم ہونے نہ پائی تھی کہ لارڈ کرزن نے (چند مہینے ولایت میں رہ کر، دوبارہ ہندوستان آتے ہی) "تقسیم بنگال" کا اعلان شائع کیا (۱۹۰۵ء ۱۳۲۲ھ)

اس میں شبہ نہیں کہ بنگال کا صوبہ جس میں اُن دنوں بہار و اڑیسہ بھی داخل تھے۔ بہت بڑا تھا اور مشرقی بنگال کو علیحدہ صوبہ بنانے سے وہاں کے مسلمانوں کو بھی ایک حد تک فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔ لیکن ہندو بنگالی اس تقسیم کے نہایت مخالف تھے اور ان کا قول تھا کہ اس تقسیم سے بنگالی قوم کی متحدہ قوت کو توڑنا اور اہل بنگال میں باہمی اختلاف پیدا کرنا مقصود ہے۔ تھوڑے دن بعد اس مخالفت نے تحریر و تقریر سے گزر کر قاتلانہ سازش کی خطرناک صورت اختیار کر لی یعنی بنگالے میں بعض اس قسم کی خفیہ انجمنیں بنائی گئیں جن میں بم سازی کی تعلیم اور انگریز عہدہ داروں کو قتل کرنے کی تدابیر سوچی جاتی تھیں۔ یہ خیالات آخر میں پنجاب و مہاراشٹر کے نوجوانوں تک پہنچ گئے لیکن اس قسم کے قتل و خون کی زیادہ وارداتیں بنگالے ہی میں ہوئیں۔ انجام کار لارڈ کرزن کی "تقسیم بنگال" کو منسوخ کرنا پڑا اور مشرقی بنگال کی بجائے صرف بہار و اڑیسہ کو ملا کر ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا گیا۔ (۱۹۱۲ء ۱۳۳۰ھ)

آثار قدیمہ اور شاہی آثار

لارڈ کرزن کے شاہانہ مزاج سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی قدیم شاہی عمارات کی حفاظت و نگرانی کا سرکار کی طرف سے معقول انتظام کر دیا گیا اور ہر صوبے نیز بعض بڑی ریاستوں میں "آثار قدیمہ" کے مستقل محکمے قائم ہوئے جن کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ ہے کہ قدیم عمارات، کتبات وغیرہ کی تلاش اور ان کے تحفظ و بقا کی کوشش کرتے رہیں اور اس کام کے لئے سرکاری طور پر ہر سال

بہت سا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

لارڈ کرزن کے زمانے کے دو قابل ذکر واقعے جن کا ترتیب سنین کے اعتبار سے اوپر ذکر آنا چاہیئے تھا، یہ ہیں کہ جنوری ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ نے وفات پائی اور شاہ اڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوئے۔ مگر بعض ناگزیر وجوہ سے انگلستان میں ۱۹۰۲ء سے پہلے تاجپوشی کا جشن منعقد نہ ہو سکا۔ اسی لیئے ہندوستان میں بھی یہ رسم ۱۹۰۲ء کے اخیر بلکہ جنوری ۱۹۰۳ء میں منائی گئی۔ اس غرض سے دہلی میں بڑی دھوم دھام کا "دربار تاجپوشی" منعقد ہوا اور اس میں ہندوستان کے اکثر رئیس، راجہ و مہاراجہ، نواب و امرا مدعو کیئے گئے۔ پھر دس برس بعد جب شاہ اڈورڈ ہفتم نے وفات پائی تو اسی قسم کا دوسرا شاہی دربار دوبارہ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں منعقد ہوا اور اس کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس دربار میں خود قیصر ہند شاہ جارج پنجم ہندوستان تشریف لائے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ بادشاہ انگلستان ہندوستان میں آکر جشن تاجپوشی منعقد کریں۔ ممالک ایشیا کی تاریخ میں اس کو ایک یادگار واقعہ سمجھنا چاہیئے۔

لارڈ منٹو، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ چیمسفورڈ

مگر اپنی تاریخ کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیئے ہمیں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ لارڈ کرزن کا جانشین منٹو (ثانی) ہوا (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء — ۱۳۲۸ھ) اور بنگالے اور دیگر مقامات کی شورش کے انسداد کی غرض سے "قانون مجالس باغیانہ" اور "قانون اخبارات" اسی وائسرائے کے عہد میں نافذ ہوئے۔ خفیہ پولس کے محکمے میں بہت توسیع و ترقی دی گئی اور تحریر و تقریر کی آزادی پر سخت قیود عائد کر دی گئیں کہ شورش انگیزوں کی خطرناک کوششوں کا سدباب ہو۔ مگر سچ پوچھیئے تو اہل ہندوستان کی شورش و ناراضی کو دفع کرنے کی سب سے بہتر تدبیر ان "آئینی اصلاحات" (مجریہ ۱۹۰۹ء — ۱۳۲۷ھ) کا نفاذ تھا جن کی بدولت اہل ہند کو سرکاری معاملات میں حصہ لینے کا پہلے سے زیادہ موقع ملا، اور مجموعی طور پر ان کی سیاسی قدر و منزلت بڑھ گئی۔

سلہ اسی سال (۱۹۰۱ء — ۱۳۱۹ھ) امیر عبدالرحمن خاں والی کابل کا انتقال ہوا اور امیر حبیب اللہ خاں اس کے جانشین ہوئے اور تھوڑے دن بعد سرکار انگریزی نے تسلیم کر لیا کہ نئے امیر کو سرکاری طور پر (ہز مجسٹی کے) بادشاہی لقب سے مخاطب کیا جائے۔

لارڈ ہارڈنگ (ثانی) ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۶ء

لارڈ منٹو کے جانشین لارڈ ہارڈنگ (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۶ء = ۱۳۳۴ء ۱۳۲۸) کے عہد حکومت کا ایک مشہور واقعہ تو وہی شاہی دربار ہے جس کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں۔ مگر جنگ ہائے طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگامے سے ہندوستانی مسلمانوں میں عام ہیجان پیدا ہونے کے علاوہ، لارڈ ہارڈنگ کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء (۱۳۳۲ء) میں دُول یورپ کے درمیان جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس میں شرکت کے لیئے ہندوستانی افواج بہ تعداد کثیر یورپ، افریقہ اور عراق عرب روانہ کی گئیں جہاں انھوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔

۱۹۱۶ء میں جب لارڈ ہارڈنگ کی میعاد حکومت ختم ہوئی تو ہندوستان کی حکومت لارڈ چیمز فورڈ کو دی گئی۔ اس وائسرائے کے عہد میں بھی کئی سال تک یورپ کی جنگ جاری رہی اور آخر اس کا فرانس و برطانیہ کی فتح و کامیابی پر اختتام ہوا لیکن ہندوستان کی تاریخ میں لارڈ چیمز فورڈ کا عہد سب سے زیادہ اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اہل ہند میں اپنی وطنی یا قومی حکومت قائم کرنے کا خیال اسی زمانے میں پھیلا اور ان کے سیاسی مطالبات و مقاصد میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا۔ دوران جنگ میں اہل ہند نے سلطنت برطانیہ کی جس جانثاری کے ساتھ خدمت کی اور نہایت نازک وقت پر جان و مال سے مدد دی اس کا برطانیہ کے بڑے بڑے مدبرین اور وزرا نے بھی اعتراف کیا لیکن ادھر تو ہندوستان میں بعض نئے اور سخت قوانین خاص کر لا قانون رولٹ، کے نفاذ سے لوگ بہت برہم ہوئے اور ادھر سلطنت عثمانیہ کی شکست اور بعد میں ترکوں کے ساتھ حکومت برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے برتاؤ سے ہندوستانی مسلمانوں کو نہایت مایوسی اور اشتعال ہوا۔ ان اسباب نے ہندو مسلمانوں کو سیاسی مطالبات میں باہم متحد کر دیا اور جب ان کے سیاسی فسور و شغب کو روکنے کے لیئے سختی کی گئی: مثلاً پنجاب کے چند اضلاع میں "لا جنگی قانون" (مارشل لا) کا نفاذ ہوا صد ہا اشخاص سرکار سے ناراضی پھیلانے کے الزام پر گرفتار کیئے گئے۔ کئی مقامات پر ہوائی جہازوں سے بم کے گولے برسائے گئے مشتبہ مجمعوں کو منتشر

کرنے کے لیئے کئی بار "مشین گن" استعمال کی گئی اور اس میں سب سے زیادہ سختی شہر امرتسر کے "باغ جلیان والا" میں ہوئی جہاں کسی میلے یا جلسے میں جمع ہونے والوں پر ایک انگریز افسر (جنرل ڈائر) نے باڑیں مارنے کا حکم دیا اور صدہا آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے تو ان واقعات نے سیاسی شورش کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ پھر ہر چند لوگوں کا جوش فرو کرنے کی کوشش کی گئی اور ۱۹۲۰ء (۱۳۳۸ھ) میں جدید "آئینی اصلاحات" نافذ ہوئیں جن کی رو سے اہل ہند کو بہت سے نئے سیاسی حقوق حاصل ہوئے لیکن ان کے گروہ کثیر نے ان اصلاحات کو ناکافی قرار دیا اور آج تک اس گروہ کے سیاسی مطالبات اور خود مختار حکومت حاصل کرنے کی کوشش و شورش میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی ہے۔

مذکورۂ بالا آئینی اصلاحات کا حال اس باب کی آخری فصل میں ہماری نظر سے گزریگا سلسلۂ بیان کو ختم کرنے کے لیئے یہاں اس قدر اضافہ کر دینا چاہیئے کہ اسی زمانے میں دولت کابل کے معمولی اختلافات کی بناء پر لڑائی چھڑی مگر زیادہ خطرناک صورت اختیار کرنے سے پہلے فریقین میں صلح ہو گئی اور سرکار انگریزی نے کابل کی کامل خود مختاری کو تسلیم کر لیا (۱۹۱۹ء ۱۳۳۸ھ)

۱۹۲۱ء (۱۳۳۹ھ) میں لارڈ چیمز فورڈ کی میعاد حکومت ختم ہو گئی اور اب انگلستان کے ایک قانون داں مدبر لارڈ ریڈنگ کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا گیا ہے۔

۲۔ جدید تعلیم و تمدن

گزشتہ ایک صدی میں انگریزوں کی حکومت سے اہل ہند کے افکار و اخلاق اور تمدن و معاشرت میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ اس پر مفصل و جامع بحث کرنے کے لیئے مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم ہندوستان کی تاریخ میں اس انقلاب کے اہم اسباب اور نمایاں اثرات پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ضرور ہے اور ان اسباب میں اہل ہند کے اندرونی تغیر کا سب سے قوی سبب جدید یا مغربی تعلیم کو سمجھنا چاہیئے۔

انگریزی تعلیم کی ابتدا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور حکومت میں انگریزی حکام کو اپنی

ہندی رعایا کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ تھی خاص کر انگریزی تعلیم کی اشاعت کو تو وہ مصلحت کے بالکل خلاف اور لوگوں کے مذہبی اشتعال کا موجب جانتے تھے۔ چنانچہ عیسائی پادریوں نے بطور خود انگریزی زبان اور عیسائی مذہب کی تعلیم کے مدرسے جاری کیئے تو انکی بھی کمپنی کی طرف سے اوّل اوّل مخالفت کی گئی اور پادریوں کا پہلا کالج سیرامپور میں قائم ہوا جہاں اس وقت ڈنمارک والوں کا عمل دخل تھا۔

سنہ ۱۸۱۳ء (۱۲۲۷ھ) میں سرکاری طور پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ "اہل ہند میں علوم کی احیا اور ترقی" کے واسطے دیا جانا منظور کیا گیا تھا لیکن یہ رقم تمام و کمال مشرقی علوم (بالخصوص مذہبی قوانین کی تعلیم) اور دیسی زبانوں کی سرپرستی میں صرف ہوتی رہی حتیٰ کہ ولیم بن ٹنگ کے عہد حکومت میں (لارڈ) مکالے "مجلس نظارت تعلیم" کا صدر نشین ہوا اور اُس نے مشرقی تعلیم یا تصانیف پر سرکاری روپیہ خرچ کرنے کی سخت مخالفت کی۔ انگریزی تعلیم کی تاریخ میں مکالے کی وہ "یادداشت" مشہور ہے جس میں اس نے عربی و سنسکرت علوم اور دیسی زبانوں کی کتابوں کا خاکہ اُڑایا ہے۔ لیکن مکالے کو اپنے مقصد میں جو کامیابی ہوئی اُس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانے میں پارلیمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی قوانین نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مشرقی علوم کی تحصیل پر اب تک جو کچھ زور دیا جاتا تھا اس کی بنا یہی تھی کہ اس وقت تک کمپنی کی عام دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں قدیم دستور کے مطابق اسلامی فقہ اور ہندو شاستروں کی رُو سے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا، اور ان مذہبی آئین کی تعلیم و واقفیت کے لیئے عربی اور سنسکرت کا پڑھنا لازمی تھا۔ مگر جب انگریزی قوانین جاری ہوئے اور فقہ و شاستر کی ضرورت بہت کم رہ گئی تو عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی چنداں ضروری نہ رہا۔ غرض مکالے کی کوشش کارگر ہوئی اور اگرچہ علوم مشرقی کے دو سرکاری مدرسے جو پہلے سے قائم تھے اُسی طرح جاری رہے لیکن گورنر جنرل کی کونسل نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ آیندہ سرکار کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اشاعت کا کام اپنے ذمّے لینا چاہیئے۔ پھر بنگال، مدراس اور بمبئی میں اعلیٰ تعلیم کے کئی اسکول اور کالج جاری کیئے گئے اور شمالی ہند کے بعض حصّوں میں ابتدائی تعلیم پر بھی توجہ کی گئی اگرچہ عام طور پر انگریز حکام اس کی وسیع

ذمہ داری لیتے ہچکچاتے تھے۔

"وڈ کا تعلیمی مراسلہ"

کونسل کے مذکورۂ بالا فیصلے کے بعد بھی کئی سال تک تعلیم کی رفتار بہت سست رہی، چنانچہ ۵۳-۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) تک کل چودہ سرکاری اسکول اور کالج جاری ہوئے جن میں طالبعلموں کا شمار چالیس ہزار سے بھی کم تھا[۵۱]۔ بایں ہمہ پادریوں کی کوشش اور سرکاری ملازمت ملنے میں آسانی کی وجہ سے اوّل تو اہل ہند میں انگریزی سیکھنے کا شوق روز افزوں ترقی کر رہا تھا، دوسرے خود انگریز حکّام کو بھی انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے انتظامی کاموں میں مدد ملنے لگی تھی۔ یہ اور بعض دیگر وجوہ نے آخر سرکار کو انگریزی تعلیم کی مزید اشاعت و ترویج پر آمادہ کر دیا اور اس مرتبہ خود نظمائے کمپنی کی جانب سے ایک مبسوط تحریری تجویز، گورنر جنرل کے نام بھیجی گئی جو "وڈ کے تعلیمی مراسلے ۱۸۵۴ء" کے نام سے مشہور ہے[۵۲]۔

اس مراسلے میں ہدایت کی گئی تھی کہ آئندہ ہندوستان کے ہر احاطے میں ایک علیحدہ محکمۂ تعلیمات قائم کیا جائے اور ان کے صدر مقامات پر ایک یونیورسٹی بنا دی جائے۔ موجود الوقت انگریزی اسکول اور کالجوں کی تعداد میں جس حد تک مناسب ہو اضافہ کیا جائے اور تحتانی یا ابتدائی مدارس کی اس طریق پر اصلاح اور نگرانی کی جائے کہ اُن کے تعلیم یافتہ طلبہ بہ آسانی فوقانی مدارس میں داخل ہو سکیں۔ ان اعلیٰ مدارس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان کو قرار دیا گیا اور ادنیٰ مدارس میں بھی "جہاں مانگ ہو" انگریزی سکھانے کا انتظام کرنے کی سفارش کی گئی۔ مراسلے میں ایسے خانگی مدارس کو امداد دینے کی بھی تحریک تھی جو اپنے نصاب تعلیم اور عام تعلیمی اصول میں سرکار کی نگرانی اور مشورہ قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

بعد کی تاریخ

مذکورۂ بالا تجاویز کے مطابق ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئی تھیں لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور بعد میں بعض مالی مشکلات کی وجہ سے

---

۵۱ گزیٹیر۔ جلد چہارم صفحہ ۱۲۴

۵۲ سر چارلس وڈ جو بعد میں لارڈ ہے لی فیکس کے خطاب سے مشہور ہوئے، اس زمانے میں نظمائے کمپنی کی مجلس نظارت کے میر مجلس تھے۔ مذکورۂ بالا تعلیمی مراسلہ، نیز مکالے کی یادداشت حال میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ از سر نو شائع کر دی گئی ہے (دیکھو رپورٹ جلد چہارم ضمیمہ دوم و سوم)

وجہ سے کئی سال تک انگریزی تعلیم زیادہ ترقی نہ کر سکی البتہ ۱۸۷۰ء سے اس کی رفتار میں نمایاں تیزی نظر آتی ہے یعنی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کے کالج کھل رہے ہیں اور بمشکل کوئی بارونق قصبہ یا تحصیل کا مقام ایسا ہوگا جہاں انگریزی تعلیم کے وسطانی (مڈل) یا فوقانی (ہائی اسکول) مدرسے جاری نہ ہوگئے ہوں۔ ابتدائی تعلیم کو بڑی ترقی اس وقت ہوئی جب کہ اس کا انتظام مقامی **بلدیات** کے حوالے کیا گیا اور ان بلدیات کو تعلیمی مصارف کے واسطے "چنگی" کا محصول وصول کرنے کی اجازت مل گئی۔

۱۸۸۰ء (۱۲۹۶ھ) میں انگریزی کالجوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ اور ان میں تعلیم پانے والے تقریباً ۲ ہزار تھے۔ پھر جب اسی زمانے میں ایک علیحدہ پنجاب یونیورسٹی (۱۸۸۲ء) اور الہ آباد یونیورسٹی (۱۸۸۷ء) قائم ہوئی تو شمالی ہند میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج میں اور بھی آسانیاں ہوگئیں۔ دوسرے یہی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں نے مغربی علوم سیکھنے پر توجہ کی۔ مذہبی تعصبات کی بناء پر وہ اب تک انگریزی مدرسوں میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۳۶ء (۱۲۵۱ھ) میں حاجی **محمد محسن** کے مذہبی وقف سے ہگلی میں ایک انگریزی کالج قائم کیا گیا تھا لیکن ۱۸۷۵ء تک کل چار سو طلبہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ تھی![1]

مسلمانوں کے تعصبات دور کرنے کی سرکار انگریزی (خاص کر لارڈ میئو) نے بھی کوشش کی اور اس میں ڈاکٹر سر سید احمد خاں بانی **مدرسۃ العلوم** (بنا ۱۸۷۷ء) **علی گڑھ** کی کوششوں سے بہت کچھ کامیابی ہوئی کہ رفتہ رفتہ شمالی **ہند** کے مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوگئے۔ بایں ہمہ سرکار کی خاص مراعات اور بعض لوگوں کی ذاتی کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ اس میدان میں اپنے ہندو ہم وطنوں سے پیچھے ہیں۔

[1] رپورٹ کلکتہ کمیشن۔ جلد چہارم صفحہ ۲۹۴۔ اس جگہ یہ صراحت کر دینی مناسب ہوگی کہ حاجی محمد محسن کا خاندان ایران سے آکر بنگالے (ہگلی) میں آباد ہوگیا تھا۔ وہ نہایت دولتمند تاجر تھے اور انھوں نے وفات سے کچھ پہلے اپنی تمام جائداد مذہبی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی (۱۲۲۱ھ) لیکن چند سال کے بعد متولیوں کی بدنظمی اور خیانت کی شکایت پر سرکار انگریزی نے اس جائداد کو جس کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ کے قریب تھی اپنی تحویل میں لے لیا اور بہت دن تک یہ روپیہ عام تعلیمی اغراض میں صرف ہوتا رہا لیکن اب زیادہ تر غریب مسلمانوں کے تعلیمی وظائف اور مدارس کی امداد کے کام میں آتا ہے۔

نہ پچھلے دنوں میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جس بلند آہنگی سے اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا، اس نے بہت سے انگریز حکام کو اس طریق تعلیم سے بدگمان کر دیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے کی بڑی غرض یہ تھی کہ سرکار کو انگریزی داں ہندوستانی ملازمین ملنے میں سہولت ہو لیکن انگریزی مدارس اور طلبہ میں جس تیزی سے اضافہ ہوا تھا اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صدہا نئے تعلیم یافتہ ملازمت سے محروم رہنے لگے لہذا اگر اُن کے ایک گروہ نے "سیاسی شورش" کو اپنا مشغلہ بنا لیا تو اس میں کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ مگر انگریزی تعلیم کے اس رواج عام کو روکنے کی اگر سرکاری طرف سے کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ چنداں کامیاب نہ ہوئی اور مجموعی طور پر سرکاری مدارس اور تعلیمی مصارف میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ خانگی اور ابتدائی مدارس کو چھوڑ کر، آج کل (انگریزی علاقے میں) صرف سرکاری کالجوں اور ثانوی مدارس کی تعداد ۸ ہزار کے قریب ہے جس میں تقریباً بارہ لاکھ ہندوستانی طلبہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں؛ ڈھاکہ، پٹنہ وغیرہ مقامات میں نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ اور ہندو اور مسلمانوں نے مخصوص تعلیمی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر بنارس اور علی گڑھ میں اپنی اپنی یونیورسٹیاں علیحدہ بنائی ہیں۔ مگر مغربی علوم کی تاریخ میں سب سے دلچسپ اور جدید تجربہ وہ ہے جس نے ریاست حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کی صورت اختیار کی۔ اور سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے قرار دیا کہ اس یونیورسٹی میں علوم مغربی کی اعلیٰ تعلیم "ہندوستانی" زبان کے ذریعے دی جائے۔

مطابع اور السنۂ ہند

مغربی علوم کی تشویق و ترویج میں سرکاری مدارس اور پادریوں کی کوشش کے علاوہ، سب سے زیادہ مدد جدید مطابع اور دیسی زبانوں کی نئی کتابوں اور اخبارات سے ملی؛ نئی قسم کے چھاپے خانے کو سب سے اوّل پادری ہندوستان لائے تھے پھر اٹھارویں صدی میں سرکاری ضرورتوں کے واسطے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزی مطابع قائم ہوئے۔ لیکن سب سے پہلا (غیر سرکاری) اخبار جو ہندوستان میں (کلکتہ سے) جاری ہوا "بنگال گزٹ" تھا (۱۷۸۰ء، ۱۱۹۴ھ) اس انگریزی اخبار کے اڈیٹر مسٹر ہکی کو وارن ہیسٹنگز کی بیوی کے خلاف مضامین لکھنے کی سزا میں کئی سال کی قید ہوئی اور اس کے جانشین "انڈین گزٹ" کے اڈیٹر کا بھی اسی قسم کا حشر ہوا؛ ان نوخیز اخبار والوں کی دریدہ دہنی سے

لنگ اکر ولزلی کے عہد میں اخبارات کی آزادی پر سخت قیود عائد کر دی گئی تھیں مگر سر چارلس مٹکاف کے زمانے (۱۸۳۵ء = ۱۲۵۰ھ) میں ان قیود کو فی الجملہ کم کر دیا گیا۔

دیسی زبانوں کے ابھرنے اور تحریری زبان بننے کا بھی زمانہ یہی ہے اور کم سے کم نثر اردو کا تو بانی مبانی انگریزوں کو سمجھنا چاہیئے۔ اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں (آرائش محفل، باغ و بہار وغیرہ) انھی کی سرپرستی میں کلکتے سے شائع ہوئیں اور آہستہ آہستہ فارسی کی بجائے ہندوستانی نیز دوسری دیسی زبانیں "سرکاری زبان" قرار دی جانے لگیں۔ دیسی زبان (بنگالی) کا پہلا اخبار "سماچار درپن" سیرامپور سے مسیحی پادریوں نے ۱۸۱۸ء میں جاری کیا۔ مگر سیسے کے حروف سے اردو تحریر کی کتابیں چھاپنے میں بہت خرچ ہوتا تھا لہذا اس زبان کے نئے جرائد و کتب کی ترقی کا زمانہ ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) سے شروع ہوتا ہے جب کہ دہلی میں لیتھو پتھر کا پہلا مطبع قائم ہوا اور تھوڑے دن بعد غالباً وہیں سے اردو زبان کا پہلا اخبار نکلا۔[1]

۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے "دیسی اخبارات" کی آزادی روکنے کے لیئے بہت سی قیود بڑھا دیں۔ مگر لارڈ رپن نے انھیں منسوخ کر دیا۔ اور پھر اس قسم کے قوانین ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں نافذ ہوئے جن سے اخبارات کی آزادی روکنے کے معاملے میں انتظامی عہدہ داروں کے اختیارات بہت بڑھ گئے اور انھیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ بغیر عدالتی مقدمہ کیئے، وہ مشتبہ مطابع کو ضبط اور اخبارات کو بند کر سکتے ہیں۔ یہ "قوانین مطابع"، عام تھے مگر ان کی زد میں زیادہ تر دیسی مطابع اور ہندوستانیوں ہی کے جرائد آئے۔ حال میں (۱۹۲۱ء) سرکار کی طرف سے اہل الرائے کی ایک جماعت ان قوانین پر غور کرنے کے واسطے متعین ہوئی تھی اور اسی کی سفارش سے مذکورۂ بالا قیود کو ایک حد تک دور کر دیا گیا ہے۔

---

[1] حال میں دیسی جرائد کی تعداد میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ "جنگ یورپ" سے پہلے اخبارات و رسائل کی کل تعداد جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شائع ہوتے تھے۔ ڈیڑھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

انقلاب کے دیگر اسباب

مغربی علوم کی اشاعت کی طرح ۔ انگریزوں کے ساتھ میل جول اور مغربی تمدن کی ترویج نے اہل ہند کی معاشرت میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیں! کنگر یا روڈ سے کی کچی سڑکیں تو لارڈ ہیسٹنگز اور ایم ہرسٹ ہی کے زمانے میں بننے لگی تھیں مگر ڈلہوزی کے عہد میں ریلوں کا آغاز ہوا اور آئندہ پچاس برس میں ان کا ہزاروں میل کا جال تمام ہندوستان میں پھیل گیا ۔ سیاحت و سفر کی آسانیوں کے ساتھ ان ریلوں کے ذریعے بیرونی تجارت کو نہایت فروغ ہوا اور یورپ کی مصنوعات ہندوستان کے گوشے گوشے میں ارزاں قیمت پر فروخت ہونے لگیں ۔ تجارت درآمد کی حیرت انگیز ترقی کا سرسری اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۴ء ۱۲۴۹ھ میں اشیاء وسے درآمد کی قیمت کا سالانہ اوسط پانچ کرور روپے سے کم تھا ۔ مگر اب (جنگ یورپ سے پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں) سوا دو ارب روپے کے قریب پہنچ گیا ہے [۱]!

۱۸۶۹ء کے اواخر (۱۲۸۶ھ) میں خلیفہ ہارون الرشید کا خواب ، حیز عمل میں آگیا ہے یعنی نہر سویز کی تیاری نے یورپ و ایشیا کے سمندروں کو ملا دیا [۲] اور انگلستان سے ہندوستان تک جہازی سفر صرف اتنے دن کا رہ گیا جتنے دن میں پہلے دہلی سے برہانپور یا اورنگ آباد پہنچا کرتے تھے ! ادھر تار برقی اور بحری تار کے ذریعے ممالک بعید سے گھنٹوں میں ایک دوسرے کی خبریں ملنے لگیں اور سیاحت و سفر کی ان انقلاب انگیز سہولتوں نے مشرق و مغرب میں آمد و رفت کا راستہ کشادہ کر دیا ۔ ہندوستان سے صدہا آدمی تعلیم و تجارت یا سیر و سیاحت کی غرض سے یورپ و امریکہ جانے اور وہاں کے آداب معاشرت اپنے ساتھ ہندوستان لانے لگے ۔ یوں بھی حکمراں اور دولتمند قوم کی ہر ادا میں دلکشی ہوتی ہے اور ہندوستان کے قدیم رسوم و تمدن کو تو جہل و اطلاع رہنے اور بھی بدنما کر رکھا تھا ۔ غرض ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ لباس اور طعام و مکان اور سواری نشست و برخاست ، رفتار و گفتار غرض ہر بات میں ہندوستان کے بہت سے

---

[۱] "فنانشل اینڈ کمرشل اسٹے ٹکس ،، مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء ۔ نیز دیکھو "اسٹیٹس مینز ایر بک سنہ ۱۹۱۹ء" وغیرہ

[۲] اس تجویز کی گذشتہ تاریخ کے متعلق دیکھو "انسائی کلو برٹ" جلد بست و ششم ۔

لوگ خاص کر نئے تعلیم یافتہ، اہل یورپ کی تقلید کرنے لگے۔

افکار و اخلاق

مگر طرز معاشرت کے ان تغیرات کے علاوہ ہندوستان والوں پر اہل یورپ کے خیالات کا بہت گہرا اثر ہوا جس وقت انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت عام اہل ہند کی علمی اور اخلاقی حالت نہایت ابتر تھی۔ بے شبہ دہلی، لکھنو، خیرآباد، جون پور وغیرہ بعض مقامات میں تیرہویں صدی ہجری (انیسویں عیسوی) تک بعض متبحر اسلامی علماء موجود تھے جن کے علم وفضل، صلاح و تقوی اور حکیمانہ تصانیف کی آج تک اسلامی دنیا میں گونج ہے لیکن اس زمانے میں ان بزرگوں کی تعلیم کا اثر بہت محدود ہوگیا تھا۔ عوام الناس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد کو بھی اپنے لغو مشاغل میں تحصیل علوم کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے اس بات کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم کو سب سے پہلے اُن لوگوں نے اپنی اولاد میں پھیلایا جو بالعموم مشرقی علوم سے بے خبر یا سطحی واقفیت رکھتے تھے۔ ورنہ کم سے کم مسلمان علماء اور جو لوگ ان کے اثر میں تھے، وہ عرصہ دراز تک اپنی اولاد کو انگریزی زبان سکھانے سے اجتناب کرتے رہے۔

بہر حال، جب ایک گروہ کثیر مغربی علوم سے آگاہ ہوا تو اہل یورپ کی تصانیف، نئے خیالات، نئے انکشافات اور نئے طرز بیان میں جو دلفریبی ہے اُس نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور جدید خیالات کے مقابلے میں قدیم فلسفہ اور ادب تقویم پارینہ نظر آنے لگے۔ نظم و نثر تحریر و تقریر اور ہر قسم کے علم وفن کے معاملات میں یورپ کی پیروی کی جانے لگی۔ اور جہاں یہ اثرات زیادہ پھیلے تھے وہاں لوگوں کے مذہبی عقائد اور اخلاق میں بھی نمایاں تغیر ہوگیا جو موجودہ زمانے کے ارباب بصیرت کے سامنے ہے۔

۳۔ آئین و اصول حکومت

لیکن کم وبیش ایک صدی کی انگریزی حکومت نے سب سے اہم انقلاب اہل ہند کے سیاسی خیالات میں پیدا کیا۔ دورِ قدیم سے قطع نظر جس کے سیاسی آئین کی کوئی واضح اور معتبر تاریخ موجود نہیں، ہندوستان میں سلاطین اسلامی کی سلطنت

سلطنت ایک جنگی حکومت کی نوعیت رکھتی تھی ایک جنگجو اور اولوالعزم سپاہی میں جو خوبیاں اور عیب ہوتے ہیں قریب قریب وہ سب مسلمانوں کے آئین حکومت میں نمایاں ہیں جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصوں میں جا بہ جا اشارہ کر چکے ہیں مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت جمہوریت کے عناصر سے خالی نہ تھی لیکن اس کا زیادہ تر رجحان شخصی بادشاہی کی طرف تھا اور آخر میں سلاطین تیموریہ نے اسی شخصی طرز بادشاہی کو نہایت استحکام کے ساتھ ہندوستان میں قائم کیا۔ ان مغل بادشاہوں کے اعلیٰ اوصاف شاہانہ سے انکار نہیں اور اقتصادی اعتبار سے اُن کے عہد حکومت میں ہندوستان نہایت دولتمند و خوش حال رہا لیکن اسی کے ساتھ عام رعایا اپنے ملکی معاملات سے بالکل بے خبر اور سیاسی حقوق سے مطلقاً محروم ہو گئی۔ لوگوں کی شخصی اور مذہبی آزادی میں کوئی خاص مداخلت نہ کی جاتی تھی۔ وضع قوانین اور اپنے مقدمات کے فیصل کرنے کا بہت کچھ دیہات کی پنچائتوں کو اختیار تھا۔ بایں ہمہ ملکی معاملات میں بادشاہ کی انفرادی رائے قول فیصل کا حکم رکھتی تھی اور اس کے احکام کے خلاف کسی کو لب کشائی کی مجال نہ تھی۔

ان آئین کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت گویا تاجروں کی بادشاہی تھی اور اس میں تمام وہ محاسن و معائب موجود تھے جو کسی تجارتی کارخانے کی خصوصیات ہیں۔ کمپنی کے ملازموں نے اوّل اوّل اہل ہند سے ملک و مال لینے میں، یا اپنے تجارتی فوائد کے لیئے ہندوستانی مصنوعات اور تجارت کو نقصان پہنچانے میں جو جو زیادتیاں کی ہیں، ان کی تفصیل پڑھنی ہو تو ولیم ڈگبی، دادا بھائی نوروجی، مسٹر دت وغیرہ مشہور مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جن میں بڑی عرق ریزی سے مذکورہ بالا "زر کشی"، اور ہندوستان کے روز افزوں افلاس کی شہادتیں، خود سرکاری بیانات اور مسلمہ واقعات سے مہیا کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں خاص طور پر جو بات جتانی منظور ہے وہ یہ ہے کہ کمپنی کے عہدہ دار اہل ہند کے حق میں کیسے ہی استبداد پسند ہوں، خود ان کا نظام حکومت "اشتراکی"، اور اس لیئے ایک حد تک جمہوری تھا اور وہ ملکر کام کرنے کے اصول اور خوبیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ دوسرے اٹھارویں صدی عیسوی (بارھویں ہجری) میں اہل یورپ کے سیاسی خیالات

میں جو زبردست انقلاب پیدا ہوا اس کے اثر سے ہندوستان کے یہ نئے حکمران مستغنی نہ تھے اور اپنی اغراض کی وجہ سے وہ اہل ہند کی آزادی کے کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں، عام لوگوں کے سیاسی حقوق کا یقیناً گذشتہ بادشاہوں اور اُن کے اُمرا سے زیادہ احساس رکھتے تھے۔

انگریزی فتح کی نوعیت

ایک اور اہم سبب جس کا آئینِ حکومت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا، یہ ہے کہ انگریزوں کا ممالک ہند پر تصرّف و تسلّط عام فتوحات سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ تاریخ کے مشہور فاضل پروفیسر سیلی نے اپنی معرکہ آرا کتاب ((دی ایکس پین شن اوف انگلینڈ)) میں نہایت محققانہ بحث کے بعد بتایا ہے کہ انگریزی قبضۂ ہند کو ((فتح)) سے تعبیر کرنا درست نہیں، درحقیقت اسے خود اہل ہند کے ایک اندرونی ملکی انقلاب کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یا کہنا چاہیئے کہ ہند کو خود اہل ہند نے (انگریزوں کیلئے) فتح کیا کیونکہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کو انگلستان سے کوئی بڑی فوج لانی پڑی نہ دوپیہ بلکہ ایک عام بدنظمی اور انتشار کے زمانے میں جب کہ کہیں کوئی والی اور کہیں کوئی فوجی سردار محض اپنی ذاتی سعی اور شخصی اغراض کے لیئے حکومت و ریاست حاصل کرنے کی تگ ودو کر رہا تھا، پہلے فرانسیسی اور پھر انگریز تاجر بھی اس دوڑ میں شریک ہوگئے اور کسی باجی راؤ یا کسی حیدر علی کی طرح انھوں نے بھی یہیں کے اجیر سپاہیوں کی مدد سے اپنے ملکی مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی۔ بلکہ کمپنی کا ان افراد کے مقابلے میں ایسی کامیابی حاصل کرلینا کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ وہ کم سے کم ایک متحد جماعت تھی اور بوقت ضرورت اپنے ملک (انگلستان) سے بھی کچھ نہ کچھ امداد حاصل کرلیتی تھی[1]۔ الغرض اگرچہ ہندوستان کے اندرونی خلفشار اور حکمران جماعتوں کی نااہلی سے کمپنی نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کو جو کامیابی ہوئی وہ بہت کچھ اہل ہند ہی کی مدد سے ہوئی تھی اور بعد میں جس قدر نظم و نسق کا کام بڑھتا گیا اسی قدر کمپنی کے ہندوستانی ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

[1] سیلی کی محولہ کتاب کے حصۂ دوم میں زیادہ تر ((ہندوستان)) ہی کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے اور خاص کر دوسرا اور تیسرا باب ((دیا ((ورس)) پڑھنے کے لائق ہے۔ مذکورۂ بالا اقوال و آرا کیلئے دیکھو صفحات ۲۰۰ تا ۲۱۱، ۲۲۰ و ۲۲۶ وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب یہ ملازمین اپنی قابلیت اور سرکار انگریزی کی خیر خواہی کے صلے میں "سول سروس" اور انگریزی عدالتوں کے ممتاز عہدوں تک ترقی کرنے لگے تو عام ہندوستانی رعایا کی مجموعی قدر و منزلت بھی انگریزی حکام کی نظر میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ؛

ابتدائی مجالس وضع قوانین

ایک مدت تک سب سے اعلیٰ انتظامی یا فوجی عہدوں تک اہل ہند کی رسائی نہ تھی اور نہ وہ حکومت عالیہ (سپریم گورنمنٹ) کی ان مجلسوں میں شریک کیئے جاتے تھے جو وائسرائے کو ملکی انتظام یا وضع قوانین کے کام میں امداد و مشورہ دینے کے واسطے بنائی گئی تھیں ، اس طرح اگرچہ مغربی آئین سے واقفیت اور انگریزی تعلیم کے اثر سے اہل ہند میں اپنے سیاسی حقوق کا احساس پیدا ہو چلا تھا اور ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) کے قانون "مجالس ہند" کے نفاذ کے وقت ہی یہ ضرورت تسلیم کرلی گئی تھی کہ ہندوستان کے لیئے جو قوانین وضع کیئے جائیں ان میں کسی حد تک اہل ہند سے مشورہ کرنا مفید ہوگا۔ لیکن اوّل تو ان ابتدائی مجالس کے اراکین کی تعداد اور اختیارات بہت غیر وقیع تھے اور ۱۸۹۲ء (۱۳۰۹ھ) کے دوسرے قانون کے اجرا تک خود وائسرائے ان اراکین کو نامزد کر دیا تھا دوسرے ۹۲ء میں جب اراکین کی تعداد میں اضافہ اور نیز محدود طریقے پر "انتخاب" کا عنصر داخل ہوا تو اس وقت بھی اس مجلس کو انتظامی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ملا اور حکومت کی اصلی باگ وائسرائے اور اس کی مجلس انتظامی ہی کے ہاتھ میں رہی جس کے سات آٹھ اراکین میں ۱۹۰۹ء (۱۳۲۷ھ) تک کوئی ہندوستانی آدمی نہ تھا[1]۔

حکومت ہند کی محکومانہ حیثیت

مگر حکومت ہندوستان کے ان آئین و اختیارات کا حال پڑھتے وقت ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کی یہ انگریزی حکومت بجائے خود آزاد و خود مختار حکومت نہیں بلکہ حکومت انگلستان کی ماتحت ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد اقتدار میں پارلیمنٹ جس طرح وقتاً فوقتاً ہندوستان کے معاملات میں دخل دیتی رہی اس کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ یہ دخل رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا کہ ۵۷ء کی شورش سے

---

[1] مذکورہ بالا حالات اکثر انگریزی تاریخوں میں جستہ جستہ منقول ہیں لیکن ہمارا خاص ماخذ مشرمونٹیگو کی "رپورٹ اول .... ریفارمز" مطبوعہ ۱۹۱۸ء ہے جس کے ابتدائی ابواب میں حکومت ہندوستان کے ابتدائی آئین پر بحث کی گئی ہے نیز دیکھو گزیٹیر جلد چہارم باب پنجم

بعد کمپنی کا اقتدار بالکل اُٹھ گیا اور اس وقت سے ہندوستان براہ راست انگلستان کی پارلیمنٹ کا محکوم بن گیا۔ پارلیمنٹ کے سامنے وزیر ہند ہندوستان کے انتظام کا ذمہ دار ہے اور یہاں کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا انتخاب و تقرر نئے آئین و قوانین کی منظوری اور تمام اہم معاملات کا فیصلہ یہی پارلیمنٹ یا انگلستان کی حکومت کرتی ہے۔ بے شبہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے پیچیدہ اور جزوی معاملات میں مقامی حکّام کو کافی اختیار دینا ناگزیر ہے اور انہی اختیارات میں اہل ہند کو شریک کرنے کی غرض سے لارڈ مورلے نے اپنی وزارتِ ہند کے زمانے میں وہ آئینی اصلاحات نافذ کیں جو "منٹو مورلے اصلاحات ۱۹۰۹ء" (۱۳۲۷ھ) کے نام سے مشہور ہیں یعنی مجالس وضع قوانین کے ہندوستانی ارکین کی تعداد اور حقوق میں اضافہ کیا گیا اور وائسرائے اور گورنروں کی انتظامی مجالس میں بھی ایک ایک ہندوستانی کو شریک کر لیا گیا بایں ہمہ ان مراعات سے اہلِ ہند کی تشفی نہیں ہوئی اور وہ ان سے کہیں زیادہ حقوق و اختیارات کا مطالبہ کرتے رہے۔

اہل ہند کے مطالبات اور نئی اصلاحات۔

ان مطالبات میں بلند آہنگی تو تقسیم بنگالہ (۱۹۰۵ء) کی شورش کے زمانے سے پیدا ہوئی تھی لیکن بعد میں دیگر اسباب سے مزید تقویت پہنچی۔ یعنی اوّل تو مسلمان جو بہت دن تک کانگرس سے علیحدہ بلکہ اس کے مخالف رہے تھے، رفتہ رفتہ اس مطالبے میں کانگرس کے ہم آواز ہو گئے کہ ہندوستان کو اسی قسم کی حکومت خود اختیاری ملنی چاہیئے جیسی کہ انگلستان کی "نو آبادیوں" کو کناڈا، آسٹریلیا، وغیرہ ممالک میں حاصل ہے۔ دوسرے جنگِ یورپ میں برطانیہ کے مدبّروں نے جنگ کے جو مقاصد اور آئندہ اصلاحات کے متعلق جس قسم کے ارادے ظاہر کئے تھے اُن سے سیاسی آزادی کا جوش بہت بڑھ گیا اور اہل ہند ممالک مغربی کے طرز پر اپنے ملک میں بھی ایک ایسی جمہوری حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے جس کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا کوئی دخل نہ ہو۔

خود حکومت برطانیہ کی طرف سے بھی دورانِ جنگ میں سیاسی مراعات کا وعدہ کیا گیا تھا، اور ۱۹۱۹ء میں اس کا ایفا ہوا یعنی وزیر ہند مسٹر مونٹیگو کی تجاویز کے مطابق ہندوستان کی قانونی اور انتظامی مجالسِ عالیہ (سپریم کونسلز) میں

ہندوستانیوں کی تعداد بڑھادی گئی۔ صوبوں کی مقامی مجلسوں میں وضع قوانین کا بہت کچھ کام اہل ہند کے انتخاب کردہ اراکین کے حوالے کردیا گیا۔ بعض مقامی محکمے، جیسے تعلیمات حفظانِ صحت وغیرہ، انہی منتخب شدہ اراکین کے افراد کے تفویض ہوئے اور انہیں (صوبے کے) وزیر (منسٹر) کا نیا خطاب ملا۔ ملکہ بنگالے کے ایک صاحب (لارڈ سنہا) کو اوّل مرتبہ "لارڈ" کا خطاب دیکر گورنری کے ممتاز عہدے پر مقرر کیا گیا جو یقیناً اہل ہند کی عزت افزائی ہے، با ایں ہمہ ہندوستان کے اکثر سیاسی سرگروہوں کی ان مراعات سے بھی سیری نہیں ہوئی اور اُن کے مطالبات آج تک برابر بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ موجودہ سیاسی بے اطمینانی کا ایک سبب تو اُن اشتعال انگیز واقعات کو سمجھنا چاہیئے جن کا اس باب کی پہلی فصل میں ہم اجمالاً ذکر کرچکے ہیں لیکن ایک اور تہ کا سبب وہی حکومت برطانیہ کا دخل و اقتدار ہے جس میں مذکورہ بالا سیاسی مراعات و اصلاحات سے بھی کوئی خاص کمی نہیں آئی۔ بے شبہ مسٹر مانٹیگو نے اپنی تجاویز میں آئندہ طریقِ عمل کے جو چار بنیادی اصول قائم کیئے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس نسبت سے اہلِ ہند کے سیاسی حقوق میں توسیع کی جائے اسی نسبت سے حکومتِ ہند کے معاملات میں پارلیمنٹ اور وزیر ہند کے دخل و نگرانی کو کم کردینا ضروری ہوگا[1]۔ تاہم جیسا کہ ان تجاویز کے شائع ہونے سے ایک سال پہلے ونسنٹ اسمتھ نے جتایا تھا[2]، درحقیقت گذشتہ پچیس تیس برس میں پارلیمنٹ اور وزیرِ ہند کی مداخلت برابر بڑھتی رہی ہے اور نہ صرف ہندوستان کے نئے آئین و قوانین کی منظوری بلکہ تمام اہم ملکی معاملات کا آخری فیصلہ دہلی اور شملے کے بجائے انگلستان کے "ایوانِ سفید" میں ہوتا ہے۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ اکبر و عالمگیر کو بعید صوبوں کے انتظام میں نہ یہ آسانیاں حاصل تھیں اور نہ تمام حالات کی اسقدر جلد اور مفصل خبریں مل سکتی تھیں جسقدر کہ اب تار برقی اور اخبارات کے ذریعے وزیرِ ہند کو لندن میں بیٹھ کر حاصل ہوجاتی ہیں!

---

[1] "رپورٹ ...... ریفارمز" صفحہ ۱۲۵

[2] اوکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۷۷۹

تمت

غلط نامہ

تاریخ ہند کتاب چہارم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١	٢	٣	٤	١	٢	٣	٤
١	٩	مقام ہر پہنے میں	مقام پر	٣٦	٩	سنہ ١٧٢٦	د سنہ ١٧٢٦ء
٢	١٥	قرائس	قرائن	٣٧	١١	دسویں صدی	اس لفظ کو ہر جگہ بتشدید "صدی" پڑھا جائے
٣	٧	کرلی جو	کرلی۔ اور یہ				
٦	٣	اور اڑسے	اڑیسے	٣٩	١٠	تو انگریزوں	نو انگریزوں
״	٨	علی وردی	علی وردی	״	١٤	کرومِ دل	کرُدمِ دِل
١٤	آخری	چندا صاحب اصلی	چندا صاحب کا اصلی	״	٢٠	اُگرے	آگرے
١٦	١٩	جیتی ہیں	جیتے ہیں	٤٢	٢	جس میں ولندیزوں	جہاں ولندیزوں
״	٢٠	نیمبہ	نتیجہ	٤٨	١٤	وگولکنڈے	یا گولکنڈے
٢٣	١٦	پُرا نام	پُرانا نام	٥٥	٢	او صحیح	اور صحیح
٢٧	١٠	سادات	مسادات	٥٦	١	پڑھای جاتی	پڑھائی جاتی
٢٨	١٣	سرہندل	سرہند کی	٥٧	٤	کہ کلکتے کی	کہ آیا کلکتے کی
״	١٧ و ١٨	مسلوّں	مسِلوں	״	٥	تھی کہ لڑائی	تھی یا لڑائی
״	٢٠	اس روے ستلج اس پار	ایں روے ستلج	٥٩	١٨	بہار کے حدود	بہار کی حدود
٢٩	١٥ و ١٦	ستلج اس پار	ایں روے ستلج	٦١	١٤	لجاحت	لجاجت
٣٥	١٢	حصے دار	حصّہ دار	٦٢	٢٢	علی الزعم	علی الرّغم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۷۰	۷	وہم	وہم	۱۴۳	۱۸	آوک لینڈ	(ہر جگہ "اوک لینڈ"
۷۵	آخری	پورنیا پرد	پورنیا کے سپرد				ہے)
۸۲	۲	پھرکے ماتحت	پھرگے کے ماتحت	۱۴۴	۱۲	دُرّہ	(ہر جگہ بلا تشدید
۸۴	۱۶	گنبتور	گنتور				"دورہ" ہے)
۹۲	۷	رکھتی	رکھنی	۱۲۵	حاشیہ سطر ۲	پریزیڈنٹ	ریزیڈنٹ
۹۸	۲۴	جب ن... بیلسلہ رکا	جب اِن... بیلسلہ رکا	۱۲۷	۱۵ و ۱۹	میک نارٹن	میک ناٹن
		...شکست ہوتی	...شکست ہوئی	۱۳۰	۱۶	تک دوؤ میں	تگ و دو میں
۹۹	۲۳	کلکتے کو	کلکتے کی	۱۳۱	۸	شرفا میں۔	شرفا میں تھا۔
۱۰۲	۲۲	پہاڑی پر	پہاڑی ریاست پر	۱۴۳	۱۸	ڈلہاوزی	ڈلہاوزی یا ڈلہوزی
۱۰۵	۱۶	کا یہ تو کام	کا تو یہ کام	۱۴۷	۷	اور شہر	اور اس شہر
۱۱۳	۲۰	ہیس ٹنگز کے	ہیس ٹنگز نے	۱۵۰	۲۰	دست پرور	دست پروردہ
۱۱۴	۷	اسی مقصد	اصلی مقصد	۱۵۴	۱۰	ہر قسم کی	ہر قسم کے
۔۔	۱۰ و ۱۵	رعیت داری	"رعیت واری"	۱۶۰	۲۱	ٹرے تیور	بڑے تیور
۱۱۶	۸	ہمیں	یہاں	۱۶۳	۲	یہ مقام	بہ مقام
۱۱۹	۳	کارنامۂ ستی	"کارنامۂ ستی"	۱۶۹	۱۱	حفالت	حفاظت
۱۲۲	۸	دراب تک بعض	اور اب تک بعض	۱۸۴	۱۳	کردیاتھا	کردیتا تھا
		...اس کو ہجو	...اس کی ہجو	۱۸۵	۱۹	جسم قسم	جس قسم

تمت